اُدم

گلدستۂ سخن

اُردو شاعری کی مختصر تاریخ اور دورِ حاضرہ کے
ممتاز شاعروں کے کلامِ زندہ جاوید
کا

نہایت دلفریب و پسندیدہ انتخاب

ایڈیٹر
سُدرشن صاحب جرنلسٹ لاہور

جسے
میسرز نرائن دت اینڈ سنز تاجرانِ کتب بیرون لوہاری دروازہ
لاہور شہر
نے سنہ ۱۹۲۲ء میں

اسلامیہ سٹیم پریس لاہور میں
باہتمام حافظ مظفرالدین
پرنٹر چھپا

پہلا ایڈیشن ۱۰۰۰ قیمت عہ .. سنہری جلد قیمت ۱۲؍

دیباچہ
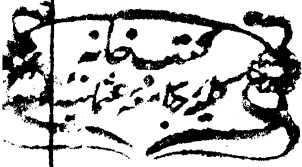
تاریخوں میں سب سے زیادہ دلچسپ تاریخ شاعری کی ہے۔کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے۔کہ زبان کس طرح بنتی ہے۔کس طرح سنورتی ہے۔کس طرح عروج حاصل کرتی ہے۔کس طرح اُس میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔اور کسطرح وہ لطافت حقیقی شاعری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔اوّل اوّل یہ انتہا درجہ کی سادہ ہوتی ہے۔لیکن اُسی چیز کو دَور زمانہ کے ہاتھ اُس سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔کہ دیکھ کر طبیعت خُوش ہوجاتی ہے۔اور قومیں اُسے اپنا اثاثہ تسلیم کرکے اُس پر سے جان و مال نثار کرنے کو آمادہ ہوجاتی ہیں۔

بعض فلاسفروں کا قول ہے کہ شاعری عالمِ خیال کا ایک خواب ہے۔جسے دُنیائے حقیقت کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔کسی خُوبصورت نظارے کو دیکھ کر جب اِنسان کے دِل میں خُوبصورت خیالات پیدا ہوتے ہیں۔اور وہ اُنہیں خوبصورت طریق سے ادا کر دیتا ہے۔تو ایک ایسی شے کا ظہور ہوجاتا ہے۔جو عام دُنیا میں کہیں نظر نہیں آتی۔لیکن اُس سے خوبصورت اُس سے بلند اُس سے وسیع ہوتی ہے۔شاعر کسی نازنین کو محوِ خرام دیکھتا ہے۔تو کبھی کہتا ہے۔کہ پھولوں کا بُوٹا بہتا چلا آتا ہے۔کبھی کہتا ہے۔کہ چاند زمین پر اُتر آیا ہے

تاروں بھری رات کو دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ کہ معشوق کی سیاہ ساڑھی میں سلمہ ستارہ جڑا ہوُا ہے۔ طلوعِ آفتاب دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ کہ کسی نازنین نے اپنے چہرے سے بالوں کو ہٹا لیا ہے۔ غرُوبِ آفتاب دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ کہ خُونِ شہیداں کی سُرخی جھلک رہی ہے۔ اور بعض وقت تو اپنے آپ کو اِسقدر بلند سمجھ لیتا ہے کہ اُسے یقین ہو جاتا ہے۔ کہ اُفق کی سُرخی اُسکی آہوں کا دھُواں ہے۔ جو آسمان پر آگ کی شکل میں ظاہر ہوُا ہے۔ یہ تعریف دیگر زبانوں پر تو نہیں لیکن اُردو پر سولہ آنے صادق اُترتی ہے۔ جہاں رنگ مبالغہ شاعری کا پہلا لوازمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور بعض وقت تو یہ مبالغہ اسقدر بڑھ جاتا ہے کہ مضحکہ خیز حالت تک پہُنچ جاتا ہے۔ مثلاً حضرت کا شعر ہے۔ ؎

صنم سُنتے ہیں تیری بھی کمر ہے — کہاں ہے کِس طرف کو ہے کِدھر ہے

گویا صنم کیا ہے۔ کوئی بھِڑ ہے۔ کہ اُس کی کمر تلگے سے بھی پتلی ہو گئی ہے۔ اور اس حالت کا ظہور کیوں ہوُا۔ اِس لئے کہ کمر کا پتلا ہونا مستورات میں خوبصُورتی کی علامت ہے۔ اِس باب میں ہِندی اور اُردو شاعر بالکل مختلف راستوں پر رواں ہیں۔ ہِندی شاعر جو کچھ دیکھتا ہے۔ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔ اور جس نظارے کو بیان کرتا ہے۔ اُسکا نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ اُردو شاعر ایک چیز کو لیتا ہے۔ اور اُس کے محاسن بیان کرنے کے لئے ساری دُنیا چھان ڈالتا ہے۔ اور اُسکو جو جو خوبصُورت چیز مِلتی جاتی ہے۔ اُن سب کی ہجو کرتا ہے۔ اور ثابت کرتا جاتا ہے کہ میرے معشوق کے سامنے اُن کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ آسمانِ خیال کے تارے توڑ لاتا ہے۔ اور اُن کو ایسے انداز سے صفحہ کاغذ پر بکھیرتا ہے۔ کہ دِل رقص کرنے لگتا ہے۔

امیر خُسرو

قدیم ہِندوستان میں سنسکرت رائج تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ حالات نے ایسا پلٹا کھایا

کہ یہ زبان محض بلند طبقہ کے اصحاب کے لئے مخصوص ہو گئی۔ اور عوام کیلئے پراکرت ایجاد ہوئی۔ جس سے بگڑ کر برج بھاشا بنی۔ لیکن وہ ابھی پوری نشو ونما حاصل نہ کرنے پائی تھی۔ کہ مسلمان حکمران ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اور زبانِ فارسی اپنے ہمراہ لائے۔ ابتدا میں یہ دونو زبانیں اپنی اپنی جگہ پر کھڑی رہیں۔ لیکن کب تک نبھتی۔ آہستہ آہستہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگے۔ اور آخر اکبر کے عہد میں اُدھر مسلمانوں نے داڑھیاں منڈوانی شروع کر دیں۔ اِدھر ہندوؤں نے فارسی کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور درباروں میں ملازمت کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دونو کی زبانیں مِل گئیں۔ اور شاہجہان کے عہد میں ایک نئی زبان کا ظہور ہوا۔ جس میں دونو زبانوں کے الفاظ یکجا جمع ہوئے۔ یہ زبان اُسوقت لشکروں میں بولی جاتی تھی۔ اِس لئے اُس کا نام اُردو (لشکر) مشہور ہو گیا۔ یہ زبان اوّل اوّل کس مپرسی کی حالت میں رہی۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اِس کا ستارہ چمکنے لگا۔ امیر خسرو نے جو ۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے۔ سب سے پہلے اُردو شاعری کی طرف توجہ کی۔ اسوقت تک مسلمان شاعر اُردو کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے۔ اور اپنے خیالات فارسی میں ظاہر کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ اُردو ایک حقیر سی زبان ہے اسلئے اِس قابل نہیں۔ کہ شاعری کے بارِ لطافت کی متحمل ہو سکے۔ لیکن امیر خسرو نے ہندی ڈھنگ پر دوہے بنائے۔ اور اُن میں فارسی الفاظ داخل کئے۔ ذیل میں ہم اُن کی چند پہیلیاں درج کرتے ہیں۔ جن سے اُسوقت کی زبان کا کچھ نہ کچھ پتہ لگتا ہے۔

آئینہ کی پہیلی

فارسی بولی آئی نا　　ترکی سوچی پائی نا

ہندی بولتے آرسی آئے　　منہ دیکھو جو اِسے بتائے

ناخُن کی پہیلی

بیسوں کا سر کاٹ لیا　　نا مارا نا خُون کیا

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے　　دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سی بھڑ جائے
بانس کا مندر واہ کا باشا۔ باشے کا وُہ کھاجا　　سنگ ملے تو سر پر راکھیں واکو واڈ راجا
سی سی کر کے نام بتایا تا میں بیٹھا ایک　　اُلٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وُہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی سُن تُو میرے لال　　عربی۔ ہندی۔ فارسی تینوں کرو خیال

اِسکے علاوہ اُنہوں نے بہت سی مکرنیاں بھی لکھی ہیں۔ اُن میں سے چند ملاحظہ ہوں:-

سگری رین مورے سنگ جاگا　　بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اُسکے بچھڑے پھاٹت ہیا　　اے سکھی ساجن۔ نا سکھی دیا

سرب سلونا سب گن نیکا　　وا بن سب جگ لاگے پھیکا
واکے سر پر ہووے کون　　اے سکھی ساجن۔ نا سکھی لون

وُہ آوے تب شادی ہوئے　　اُس بن دوجا اَور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول　　اے سکھی ساجن۔ نا سکھی ڈھول

امیر خسرو حاضر جواب بہت تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ اُنہوں نے ایک کنوئیں پر جاکر پانی مانگا۔ وہاں چار عورتیں گھڑے بھر رہی تھیں۔ اُنہوں نے پُوچھا۔ تو کون ہے؟

جو با بدبا خسرو۔ خسرو کے نام کے اُسوقت ڈنکے بج رہے تھے۔ ایک عورت نے کہا۔ میں پانی تو پلا دوں گی لیکن تو مجھے کھیر کا ایک شعر بنا دے۔ دُوسری نے کہا۔ نہیں چرخے کا بنا دے۔ تیسری بولی۔ مجھے کُتے کا چاہیئے۔ چوتھی نے ڈھول کی فرمائش کی۔ امیر خسرو نے کہا۔ پہلے پانی تو پلا دو۔ بعد میں شاعری بھی ہو جائے گی۔ لیکن عورتوں نے کہا۔ نہیں پہلے ہماری چیز تیار کر دو۔ خسرو نے چند منٹ سوچا اور تب کہا۔ ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا　　آیا کُتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اِسی طرح کبھی کبھی دو سُخنے بھی کہا کرتے تھے۔ اُن میں خُوبی یہ ہے۔ کہ سوال دو کرتے ہیں اور جواب ایک دیتے ہیں۔ لیکن جواب کا ایک لفظ دو معنوں میں استعمال ہوکر دونوں سوالوں کے جواب دیدیتا ہے۔ مثلاً

گوشت کیوں نہ کھایا؟
ڈوم کیوں نہ گایا؟　} گلا نہ تھا

جُوتا کیوں نہ پہنا؟
سمبوسہ کیوں نہ کھایا؟　} تلا نہ تھا

انار کیوں نہ چکھا؟
وزیر کیوں نہ رکھا؟　} دانا نہ تھا

گھوڑا اَڑا کیوں؟
پرانٹھا سڑا کیوں؟　} پھیرا نہ تھا

لیکن یہیں پر بس نہیں۔ امیر خسرو نے گیت بنانے میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اور بالکل ہندی رنگ میں نہ تصنع نہ بناوٹ۔ صاف صاف باتیں ہیں اور معمولی ڈھنگ سے بیان کر دی ہیں۔ مثلاً نیچے جو گانا دیا جاتا ہے۔ وہ ایک

لڑکی کی طرف سے ہے۔ جو سسرال میں ہے۔ برسات کی بہار آتی ہے۔ جھولے پڑجاتے ہیں۔ لڑکی کو میکہ یاد آجاتا ہے۔ جھولتی ہے اور گاتی ہے :-

اماں میرے بادا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بادا تو بُڈھا ری کہ ساون آیا
اماں میرے بھیا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا

یعنی اے ماں ساون کی رُت آگئی ہے۔ میرے باپ کو بھیج کہ مجھے آکر لے جاوے۔ پھر خود ہی ماں کی طرف سے جواب دیتی ہے کہ بیٹی وُہ بوڑھا ہے۔ کیسے آسکے گا۔ پھر کہتی ہے۔ کہ اچھا تو بھائی کو ہی بھیجدو۔ لیکن وہ چھوٹا ہے۔ آخر میں کہتی ہے۔ کہ باپ بُڈھا ہے۔ بھائی بچّہ ہے تو ماموں کو ہی بھیجدو وُہ تو جوان ہے سمجھدار ہے۔ لیکن ماں کا جواب کیا مزیدار ہے۔ کہ وُہ بانکا آدمی ہے۔ میرا کہنا نہ مانے گا۔

کیا خیالات ہیں۔ کہ نظارہ سامنے کھچ جاتا ہے۔ انہی خیالات کو اگر آج کل کا شاعر نظم کرے تو کہے "صبح صادق کا وقت ہے۔ اور میں خواب دیکھ رہی ہوں کہ قُدرت نے میری عُمرِ رفتہ واپس لوٹا دی ہے۔ اور میں از سرِ نو اپنے وطن کی بہاریں لُوٹ رہی ہوں۔ جہاں قہقہے کی حکومت ہے۔ اور نُور کا ظہور ہے۔ وہاں فرشتے گاتے ہیں۔ اور پریاں اپنے تبسّم کی کرنیں پھینک کر جادُو کر رہی ہیں"

بلاشبہ یہ الفاظ زیادہ حسین ہیں۔ اور ان سے انسان پر از خود رفتگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت سے کوسوں دُور ہیں۔ اور جو شاعری کو

سمجھتا ہے وہ تسلیم کرے گا کہ امیر خسرو نے چند سطروں میں صداقت کو بند کر دیا ہے۔ اور شاعری کا حق ادا کر دیا ہے۔

اُردو شاعری کی ابتدا

لیکن امیر خسرو نے زیادہ تر ہندی دوہوں کے ڈھنگ پر شاعری کی ہے۔ اُنہوں نے فارسی بحروں کو اُردو میں لانے کی کوشش نہیں کی اگر کرتے تو اُردو کے سب سے پہلے شاعر کہلاتے۔ لیکن یہ درجۂ امتیاز قدرت نے شمس ولی اللہ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ کوئی دُوسرا کیونکر لے جاتا۔ حضرت ولی احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئے۔ کہاں پڑھے؟ کہاں پلے؟ شعر و سخن کی لذت سے اُن کے ہونٹ کب آشنا ہوئے۔ یہ تمام امور تاریکی میں ہیں۔ لیکن اُنہوں نے وہ کام کیا جس سے اُن کا نام امر ہو گیا۔ یہ اُنہی کی برکت ہے۔ کہ آج اُردو شاعری فارسی کے پہلو بہ پہلو چل رہی ہے۔ اور اُس میں فارسی کی تمام بحریں، ردیف قافیئے، مسدّس، مخمس، قطعے، داخل کئے۔ اُردو نظم کو ان کو وُہی نسبت ہے۔ جو انگریزی کے ساتھ چاسر کو۔ فارسی کے ساتھ رودکی کو اور ہندی کے ساتھ کو ہے۔ اُس وقت تک اُردو شاعری ہندی کے دوہوں۔ چھندوں اور کبتوں تک محدود تھی۔ لیکن ولی صاحب نے اُسکے لئے نیا دروازہ کھول دیا۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک نہایت وسیع میدان مُہیا کر دیا۔ اُن کا دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں مندرجۂ ذیل الفاظ عام طور پر استعمال کئے جاتے تھے:۔

سے	کی بجائے	سوں سیں اور سیتی	آنکھوں	کی بجائے	انکھڑیاں۔ نین
کو	" "	کوں	یہہ	" "	یوہ
ہم کو	" "	ہمن کو	مجھے	" "	مجھ

دُنیا میں کی بجائے	جگ منے	کو کی بجائے	کے تئیں
کلام " "	بچن	میں " "	موں
ہمیشہ " "	نِت	خاکِ پا "	خاکِ چرن
مُنہ " "	مُکھ	دِکھائی دیتا " "	دِستا
تسبیح " "	تسبی	آئینہ " "	آرسی
تیرے دِل " "	تجُھ دل	ترک کرکے " "	تج کر یا تج
بیگانا " "	بگانا	ظُلم " "	ظالمی
اندر " "	بھیتر	دیدار دے " "	درس دکھا
معشوق " "	موہن	ویران " "	سُنجاں
آنسُو " "	انجھو	جیسا " "	سریکا
بھویں " "	بھواں	بھاؤ " "	بھا
پلکیں " "	پلکاں	دِل " "	مَن

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

بے وفائی نہ کر۔ خُدا سوں ڈر   جگ ہنسائی نہ کر۔ خُدا سوں ڈر
ہے جُدائی میں زندگی مُشکل   آ۔ جُدائی نہ کر۔ خُدا سوں ڈر
اُس سوں جو آشنائی دُور کرے   آشنائی نہ کر۔ خُدا سوں ڈر
آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرُور   خود نمائی نہ کر۔ خُدا سوں ڈر

جس وقت اے سری جن تو بے حجاب ہوگا   ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا
مت جا چمن موں لالہ بُلبُل پہ مت ستم کر   گرمی سوں تجھ نگاہ کی گلگل گلاب ہوگا
مت آئینہ کو دِکھلا اپنا جمال روشن   تجھ مُکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا

نکلا ہے وہ ستمگر تیغِ ادا کوں لے کر　　سینے پہ عاشقاں کے اب فتحیاب ہوگا
رکھتا ہے کیوں جفا کو مجھ پر روا اے ظالم　　محشر موں تجھ سیں آخر میرا حساب ہوگا
ہاتف نے یوں دیا ہے مجھ کو ولی بشارت
اس کی گلی میں جا تو مقصد شتاب ہوگا

دل ولی کا لے لیا دِلی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

جب ولی دِلی پہنچے۔ تو شور مچ گیا۔ اور قدر دانانِ زبان نے اُن کو سر آنکھوں پر جگہ دی۔ چپے چپے پر شاعر پیدا ہو گئے۔ اور شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں لیکن جو سُر نکلتی تھی۔ ولی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ اور جو غزل کہتا تھا۔ ولی کی تقلید میں۔ قیاس کہتا ہے۔ کہ اُسوقت سینکڑوں اشخاص کو یہ چسکا پڑ گیا ہوگا لیکن زمانہ کے ہاتھ نے سب کا نام مٹا دیا۔ اب صرف آبرو ناجی۔ یکرنگ کے نام باقی رہ گئے ہیں۔

کلام کا نمونہ دیکھئے:۔

(۱)

نین سیں نین جب ملائے گیا　　دِل کے اندر میرے سمائے گیا
نگہ گرم سیں میرے دِل میں　　آ کے اِک آگ سی لگائے گیا
تیرے چلنے کی سُن خبر عاشق　　یہی کہتا مُوا کہ ہائے گیا
سہو کر بولتا تھا مجھ سیتی　　بوجھ کر بات کو چھپائے گا
آبرو ہجر بیچ مرتا تھا　　مُکھ دِکھا کر اُسے جلائے گا

یہ رسمِ ظالمی کی دستور ہے کہاں کا　　دِل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا
ہر یک نگہ موں ہم سوں کرنے لگے ہو نوکیں　　کچھ یو تیری آنکھوں نے پکڑا ہے طور بانکا

مت قہر سیتی ہاتھ میں لے دِل ہمارے کوں　　جلتا ہے کیوں پکڑتا ہے ظالم انگارے کوں
میں آ پڑا ہوں عشق کے ظالم بھنور کے بیچ　　تختہ اُوپر چلا دتے ہیں جی کے آرے کوں
اپنا جمال آبرو کوں ٹک دکھاؤ آج　　مُدت سے آرزو ہے درس کی بچارے کوں

(۲)

دیکھ موہن تیری کمر کی طرف　　پھر گیا مالی اپنے گھر کی طرف
جن نے دیکھے تیرے لبِ شیریں　　نظر اُن کی نہیں شکر کی طرف
ہے محال اُن کا دام میں آنا　　دِل ہے اِن سب بُتاں کا زر کی طرف
تیرے رُخسار کی صفائی دیکھ　　چشم دانا نہیں ہُنر کی طرف

حشر میں پاکباز ہے ناجی
بدعمل جائیں گے سقر کی طرف

(۳)

پارسائی اَور جوانی کیونکر ہو　　ایک جاگہ آگ پانی کیونکر ہو

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے　　دِل سے صبر و قرار جاتا ہے
گر خبر لینی ہے تو لے صیّاد　　ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

کیا سیدھی سادی باتیں ہیں۔ کہ نہ سوچنے کی ضرورت ہے۔ نہ ڈکشنری کی حاجت۔ جو کہنا تھا۔ صاف صاف کہہ دیا۔ نہ دماغ لڑاتے ہیں۔ کہ کوئی پیچدار بات

کہیں۔ نہ گھنٹوں پریشان ہوتے ہیں۔ کہ مبالغہ کا طومار باندھیں۔ آج کل کے شاعر کہیں گے۔ کیا بیہودگی ہے۔ لیکن نہیں یہ بیہودگیاں نہیں۔ اُردو شاعری کا ابتدائی دَور ہے۔ اُنہوں نے وُہ بیج بوئے۔ جن کا پھل آج لوگ کھا کھا کر چٹخارے لے رہے ہیں۔ اُنہوں نے وُہ بُنیادیں رکھیں۔ جن پر آج عالیشان عمارتیں کھڑی ہیں۔ یا یُوں کہیئے۔ کہ اُنہوں نے وُہ پٹڑی تیار کی جس پر آج گاڑیاں چل رہی ہیں۔

دُوسرا دَور

جواہراتِ شعر و سخن کے جوہریوں نے اُردو شاعری کے دُوسرے دَور میں شاہ حاتم۔ خانِ آرزو اور نواب فُغاں کو رکھا ہے۔ انکے زمانہ میں اُردو شاعری کا قدم آگے بڑھا۔ نئے الفاظ داخل ہُوئے۔ پُرانے چھوڑ دیئے گئے لیکن پھر بھی حسب ذیل الفاظ استعمال ہوتے رہے۔

سے	کی بجائے	سیتی	طرف	کی بجائے	اور
جل گیا	〃 〃	بَل گیا	حَیران ہونا	〃 〃	بھچک جانا
صدقے	〃 〃	بَل	جانے والا	〃 〃	جانے ہارا
دِل	〃 〃	مَن	فرماتا ہے	〃 〃	فرماتا ہے
پراٹھا	〃 〃	پردٹھا	جاتا ہے	〃 〃	جاتا ہے
آہستہ	〃 〃	دھیرا	اُنہوں	〃 〃	اُن
میں	〃 〃	کے بیچ یا بھیتر	جدھر	〃 〃	جیدھر

اِس دَور کے دو امتیازی نشان ہیں۔ اوّل یہ کہ ان کے شاگردوں نے اُردو شاعری کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ دُوسرے یہ کہ اُنہوں نے اپنے زمانہ

میں فارسی کے محاورے، فارسی کے خیالات اور فارسی کے واقعات اُردو میں داخل کئے۔ گویا ہندوستان کی سرزمین پر فارس کے پھولوں کا نظارہ دکھا دیا۔ لیکن ان میں بے ساختہ پن اسقدر زیادہ ہے کہ انسان لٹو ہو جاتا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں۔ سیدھے سادے طریق میں کہتے ہیں۔ اور ایسے الفاظ میں کہتے ہیں۔ کہ سُننے والا کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہے۔

اِس سلسلہ کے پہلے شاعر شیخ ظہور الدین حاتم تھے۔ ۱۱۱۱ھ میں بمقام شاہجہان آباد پیدا ہوئے۔ اور بڑے ہو کر فوج میں داخل ہو گئے۔ لیکن جب حکومت کی بے ترتیبی دیکھی۔ تو دِل برداشتہ ہو گئے۔ اور ترکِ ملازمت کا موقع تلاش کرنے لگے۔ اتّفاق سے اُنہی ایّام میں ولی کا دیوان دِلّی پہنچا۔ اور لوگ شاعری کی طرف متوجّہ ہوئے۔ شیخ صاحب کے دِل نے بھی چٹکی لی تلوار آہنی کی بجائے تیغِ قلم کے جوہر دِکھانے پر آمادہ ہوئے۔ مذاق پسند آدمی تھے چنانچہ جب اُن کا دیوان شائع ہوا۔ تو بعض آدمیوں نے کہا۔ شیخ صاحب آپ کا دیوان تو دیوانوں کا باپ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ صاحب اسوقت تو چُپ رہے۔ لیکن تھوڑے دِنوں کے بعد اُس کو چھانٹ کر چھوٹا کر دیا۔ اور اُس کا نام رکھّا دیوآن زادہ۔ جب کسی نے باعث پُوچھا۔ تو جواب دیا۔ کہ اِس کی پیدائش دیوان سے ہُوئی ہے۔ اِس لئے دیوآن زادہ ہے۔ ان کے ۴۵ شاگرد تھے جن میں سے میرزا سودا۔ سعادت یار خاں رنگین اور محمدؐ امان نثار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میرزا سودا سے آپ کو بہت محبّت تھی۔ اور فرمایا کرتے تھے۔ کہ یہ شاگرد میرے نام کو امر کر دیگا۔ اور واقعات نے بتلایا۔ کہ یہ اُنکی غلطی نہ تھی۔

شیخ صاحب اپنی غلطی ماننے کے لئے ہر وقت طیار رہتے تھے۔ چنانچہ ایکدفعہ محفلِ مشاعرہ گرم تھی۔ شاگرد اپنا اپنا کلام سُنا رہے تھے۔ شیخ صاحب نے اپنا کلام پڑھا

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

سعادت یار خاں رنگین نے کہا۔ اُستاد اگر یوں کہیں۔ تو کیسا رہے۔

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

دُوسرے شاگردوں کو یہ گُستاخی بہت بُری لگی۔ لیکن شیخ صاحب کے چہرے پر ملال نہ تھا۔ ہنسکر بولے۔ بہت خُوب! مشق نہ چھوڑنا۔ کسی دن شہرت قدم چُومے گی۔ ان کا کلام دیدانت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مثلاً

چھپا نہیں جا بجا حاضر ہے پیارا کہاں وُہ چشم ؟ جو ماریں نظارا

جُدا نہیں سب سیتی تحقیق کر دیکھ مِلا ہے سب سے اور سب سے ہے نیارا

مُسافر اُٹھ تجھے چلنا ہے منزل بجے ہے کوچ کا ہر دم نقّارا

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے کیا ہے جس نے اِس جگ سوں کنارا

سیانے خلق سے یوں بھاگتے ہیں کہ جوں آتش ستی بھاگے ہے پارا

سمجھ کر دیکھ سب جگ بیچ ماہی کہاں ہیگا سکندر کہاں ہے دارا

صفا کر دِل کے آئینہ کو حاتم
دیکھا چاہے سجن گر آشکارا

کانوں کا یہ سخن مُدت سوں مجھ کو یاد ہے جگ موں بے محبوب جینا زندگی برباد ہے

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

۱۲۰۷ھ میں دِلّی میں فوت ہوئے۔

خان سراج الدین علی خانِ آرزو کو اُردو شاعری سے وُہی نسبت ہے۔

جو ارسطو کو منطق سے ہے۔ اگر یہ سچ ہے۔ کہ تمام منطقی ارسطو کے فرزند کہلانا داخلِ فخر سمجھتے ہیں۔ تو یہ بھی سچ ہے۔ کہ تمام اُردو شاعر خانِ آرزو کے بیٹے کہلانا اپنے لئے باعثِ عزت خیال کرتے ہیں۔ اُن کے شاگردوں میں سے میرزا جانجاناں مظہر۔ میر تقی۔ خواجہ میر درد جیسے باکمال شعرا کا ظہور ہوا جنہوں نے اُردو شاعری کو پر لگا دیئے۔ اور اُس کے لئے نیا آسمان ڈھونڈھ نکالا۔

خان صاحب دراصل اُردو کے شاعر نہ تھے۔ نہ ہی اِس زبان میں شعر کہنا فخر سمجھتے تھے۔ اُن کی توجہ تمام تر فارسی کی طرف تھی۔ اور فارسی میں اُنکا کلام اِسقدر بلند ہے۔ کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سن پیدائش کا پتہ نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہوا ہے۔ کہ ۱۱۶۹ھ میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔

اُردو کے شعر کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔ نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دِل تو کیا کرے　　بیکار ہے اٹک نہ رہے دِل تو کیا کرے

آتا ہے ہر سحر اُٹھ تیری برابری کو　　کیا دِن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
اُس تُند خو صنم سے جب سے لگا ہوں ملنے　　ہر کوئی مانتا ہے میری دِلاوری کو

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے　　چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

ان کے شاگردوں میں ایک نوجوان بہت خوبصورت تھا۔ وہ روزانہ خِدمت میں حاضر ہوتا۔ اتفاقاً چند دن نہ آیا۔ ایک دن خان صاحب بازار میں بیٹھے تھے۔ کہ وہ اُدھر سے گذرا۔ اُنہوں نے بلایا۔ اُسے شاید کوئی ضروری کام تھا جلدی سے گذر گیا۔ خان صاحب نے آدمی بھیجکر بُلوایا اور کہا۔ تمہارے لئے ایک شعر کہا ہے

سُنتے جاؤ۔ ؎

یہ ناز، یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا کیا تُم جوان ہو کے بڑے آدمی ہُوئے

اِس دَور کے تیسرے شاعر نواب اشرف علی فغاں تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اِنہیں قزلباش خاں اُمید کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ نوابصاحب کا اپنا بیان ہے۔ کہ مَیں نے حضرت ندیم سے اصلاح لی۔ دیکھئے :-

ہرچند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں دو دن کے بعد دیکھیو اُستاد ہو گیا

یہ احمد شاہ دُرّانی کے زمانہ میں ہُوئے ہیں۔ دربارِ دہلی میں مُلازم تھے۔ لیکن جب احمد شاہ کے حملوں نے دہلی کو زیر و زبر کر دیا تو مرشدآباد چلے گئے۔ اَور وہاں سے عظیم آباد پہنچے۔ جہاں راجہ شتاب رائے ان کے ساتھ بہت عزت سے پیش آئے۔ اَور ساری عمر اپنے پاس ہی رکھا (ایک دن کا ذکر ہے۔ آپ نے ایک غزل پڑھی۔ جس کا قافیہ تھا لالیاں۔ نالیاں۔ جالیاں۔ راجہ صاحب کے دربار میں ایک مسخرا میاں جُگنو بھی تھا۔ اُس نے کہا۔ اُستاد اَور سب قافیے آگئے۔ لیکن تالیاں رہ گیا۔ اِنہوں نے ٹال دیا۔ لیکن میاں جُگنو کب خاموش رہتے تھے۔ پھر بولے اَور زور کے ساتھ بولے۔ راجہ شتاب رائے نے کہا۔ نواب صاحب۔ آپ نے سُنا۔ میاں جُگنو کیا کہتے ہیں۔ جواب دیا۔ جی ہاں سُنا۔ مَیں نے جان بُوجھ کر یہ قافیہ چھوڑ دیا تھا۔ راجہ صاحب نے کہا۔ اب کہہ دیجئے۔ نواب صاحب نے فوراً کہا۔ لیجئے

جُگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو سب دیکھ دیکھ اُسکو بجاتے ہیں تالیاں)

راجہ صاحب بہت خُوش ہُوئے۔ اُن کی شاعری اِس طرح کی تھی :-

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی

شِکوہ تو کیوں کرے ہے میرے اشکِ سُرخ کا تیری کب آستیں میرے لوہو سے بھر گئی

میں اپنا حال دیکھ کر فوراً بھچک گیا   دل بھی اُدھر گیا میری جیدھر نظر گئی
تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں   انصاف کو نہ چھوڑ مروّت اگر گئی
آخر فغاں وہی ہے اُسے کیوں بھلا دیا   وہ کیا ہوئے تپاک وہ اُلفت کدھر گئی
مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے   یوں بھی گذر گئی میری وُوں بھی گذر گئی

مُفت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہے   آ مرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے
لئے جاتی ہے اجل جانِ فغاں کو لے یار   لیجیو تیرا گرفتار کہاں جاتا ہے

کھا پیچ و تاب مجھ کو ڈسیں اب وہ کالیاں   ظالم اسی لئے میں نے زلفیں تھیں پالیاں
دیکھا کہ یہ تو چھوڑتا ممکن نہیں مجھے   چلنے لگا وہ شوخ مراتب یہ چالیاں
ہر بات بیچ رُوٹھنا ہر دم میں ناخوشی   ہر آن دُوکھنا مجھے ہر وقت گالیاں

تھا یہ خیال خواب میں ہیگا یہ روزِ وصل
آنکھیں جو کھل گئیں تو وہی تھیں ہیں کالیاں

تیسرا دور

اِس دور میں میرزا سودا میر سوز۔ خواجہ میر درد اور میر تقی چار شاعر ہوئے جنہوں نے اپنے زمانہ میں اُردو کو پیتل سے سونا بنا دیا۔ اور اِس میں وہ وہ لطافتیں پیدا کیں۔ کہ اُردو بھی اپنا سر بلند کرنے کے قابل ہوگئی۔ اِس وقت تک فارسی کے خیالات اُردو میں آتے تھے۔ لیکن اِسی طرح جس طرح مخمل کے اُوپر موتی رکھ دیئے ہوں۔ مگر ان باکمال حضرات نے اُن کو اُردو میں اِس طرح کھپایا جس طرح مصری دُودھ میں گھل جاتی ہے۔ اور یہ انہیں الگ کرنا دشوار

ہو جاتا ہے۔ اِنہوں نے تخیل کی پرواز میں نئے نئے خیالات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالا اور شاعری کا رنگ بدل دیا۔ آپس میں ایک دوسرے پر چوٹیں بھی کرتے رہے۔ اور ایک دُوسرے کے خلاف زور شور سے لکھتے بھی رہے۔ یہ ایک بُرائی تھی۔ جو پَیدا نہ ہوتی۔ تو اچھا تھا۔ شاعر لوگ دُنیا سے بے پرواہ ہوتے ہیں۔ اُن کی اپنی حکومت ہوتی ہے۔ جہاں تانیں اُڑتی ہیں پھُول جھکتے ہیں۔ چاند چمکتا ہے۔ اور بہشت کی ہوائیں چلتی ہیں۔ وُہ معمُولی مکان میں بستے ہیں۔ لیکن محلوں کا لُطف اُٹھاتے ہیں۔ وُہ عموماً غریب کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن اُمرا اُن پر رشک کرتے ہیں۔ اور شہرت اُن پر نثار ہوتی ہے۔ پھر اگر وُہ خُود ہی ایک دُوسرے پر چوٹیں کرنے لگیں۔ تو اُنکا اثر کیا خاک باقی رہیگا

اِس دور میں زبانِ اُردو کو اور بھی صاف کیا گیا۔ لیکن پھر بھی ایسے الفاظ تھے جو اُس وقت استعمال ہوتے تھے۔ لیکن اب غلط قرار دیدیئے گئے ہیں۔ اُن کی فہرست یہ ہے:-

تونے	کی بجائے		تیں	ہلنا	کی بجائے		ہَلنا
ہمیشہ	״	״	نِت	گھِسنا	״	״	گھسنا
مٹی	״	״	ماٹی	رُوح	״	״	جیوڑا
مل	״	״	رَل	پتھر	״	״	پتھر
لگا	״	״	لاگا	بجتا	״	״	باجتا
ہمارے پاس	״	״	[illegible]	نام	״	״	ناؤں
ایک	״	״	ایکوں	کب تک	״	״	کب لگ
کہتے ہو	״	״	کہو ہو	اُس نے	״	״	اُنے
اُدھر	״	״	تِدھر اور اُودھر	ٹٹولتا ہے	״	״	ٹٹولے ہے

اُن سے کی بجائے		اُن کنے	بات کی بجائے		بچن
آتی تھیں "	"	آتیاں تھیں	ذرا "	"	ٹک
میری جان "	"	میراجان	تمہاری "	"	تماری

اِس دَور کے سب سے پہلے شاعر میرزا محمد رفیع سودا تھے۔ جو ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اصلی وطن کابل تھا۔ لیکن باپ کے ساتھ ہندستان آئے۔ اَور یہاں کی سرزمین ایسی پسند آئی۔ کہ یہیں کے بن گئے۔ اَور جب ۱۱۹۵ھ میں فوت ہوئے۔ تو ہڈیاں بھی یہیں دفن ہوئیں۔ اِنکا بچپن دِلّی میں گذرا جوان ہوئے۔ تو شعر و سخن کا چسکا لگا۔ اَور خانِ آرزو سے اصلاح لینے لگے۔ اُسوقت میرزا فارسی نظم کہتے تھے۔ خانِ آرزو نے مشورہ دیا۔ کہ تم اصلی باشندے کابل کے ہو۔ لیکن دِلّی میں پلے ہو۔ اب فارسی تماری زبان نہیں رہی۔ اِس لئے بہتر ہو کہ تم اُردو میں خیالات کا اظہار کرو۔ شہرت تمارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ بات میرزا سودا کے دِل میں بیٹھی۔ فارسی کا خیال چھوڑ دیا۔ اَور اُردو کی جانب متوجہ ہوئے۔ چند ہی دِن مشق کی تھی۔ کہ دِلّی میں ڈنکے بجنے لگے۔ اَور دُور دُور تک دھوم مچ گئی۔ اُسی زمانے میں میر تقی میدان میں نکلے۔ قلم کے دھنی۔ میرزا سودا اَور میر تقی کا کئی بار مُقابلہ ہُوا۔ بلاشُبہ میر تقی کے کلام میں زور اَور روانی دونو کی کمی نہیں۔ اَور وُہ میرزا سودا سے افضل و برتر خیال کئے جاتے ہیں لیکن کئی دفعہ میرزا سودا میر تقی کو پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ مثلاً ایکدفعہ میر تقی نے کہا:

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

میرزا سودا نے سُنا۔ تو کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ شعر میر صاحب کا نہیں۔ اُن کی ماں کا ہے۔ اگر میں کہتا۔ تو یوں کہتا۔

سودا کے ~~سرہانے جو گیا~~ جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

ناصر

ناظرین غور سے دونو شعروں کو دیکھیں۔ تو ان کا فرق معلوم ہو۔ میر صاحب کے کلام سے واقعی یہی رنگ جھلکتا ہے۔ کہ کوئی عورت مریض کے سرہانے بیٹھی ہے۔ اور کہہ رہی ہے۔ کہ ذرا آہستہ بولو۔ بیچارہ ابھی ابھی سویا ہے۔ جاگ اُٹھے گا۔ مگر میرزا سوداؔ کے کلام کا رنگ نرالا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ جب قیامت ہوئی۔ اور اُس کا شور سوداؔ کے سرہانے تک گیا۔ تو ملازموں نے عرض کی۔ کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔ بیان میں کیسی شوخی ہے۔ کہ دل اُچھل پڑتا ہے۔ ذیل میں ہم میرزا سوداؔ اور میرؔ صاحب کے مقابلے کا ایک ایک شعر درج کرتے ہیں۔ جس میں میرزا صاحب میرؔ صاحب کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

میرؔ۔ چمن میں گُل نے جو کل دعوئے جمال کیا ۔۔۔ جمالِ یار نے مُنہ اُس کا خوب لال کیا
سوداؔ۔ برابری کا تیری گُل نے جب خیال کیا ۔۔۔ صبا نے مار تھپیڑا مُنہ اُس کا لال کیا

اِسی طرح کئی مضمون باندھے ہیں۔ جن میں سوداؔ صاحب کی برابری میرؔ صاحب نہیں کر سکے۔ ذیل میں ہم میرزا صاحب کی غزلوں کا انتخاب دیتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ آپ کے خیالات میں کسقدر بلندی اور اچھوتا پن ہے۔

خُدا کے حاضر مطلق ہونے کا مضمون باندھتے ہُوئے کہتے ہیں:۔

۱۔ غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں ۔۔۔ جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں
۲۔ دِل کے پُرزوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں ۔۔۔ کچھ عِلاج ان کا بھی اَے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
۳۔ جُرم ہے اُسکی جفا کا کہ وفا کی تقصیر ۔۔۔ کوئی تو بولو میاں مُنہ میں زباں ہے کہ نہیں
۴۔ پاسِ ناموس مجھے عشق کا ہے اَے بُلبُل ۔۔۔ ورنہ یاں کونسا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں
۵۔ پُوچھا سوداؔ سے میں اِک روز کہ اَے آوارہ ۔۔۔ تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں

ایک اَور غزل کے کچھ اشعار دیکھیئے:۔

۱۔ افعی کو یہ طاقت ہے کہ اُس سے بسر آوے ۔۔۔ وُہ زلفِ سیاہ اپنی اگر لہر پہ آوے

۲۔ صُورت ہمیں اُس مہر کی پہچان اگر آوے　　ہر ذرّہ میں کچھ اور ہی چمکا نظر آوے
۳۔ کہہ کہہ کے دُکھ اپنا میں کیا مغز کو خالی　　اتنا نہ ہُوا اُس کے تیری چشم بھر آوے
۴۔ سب کام نکلتے ہیں فلک تجھ سے ولیکن　　میرے دلِ ناشاد کی اُمید بر آوے
۵۔ دینا ہے کوئی مُرغِ دل اُس شوخ کو سودا　　کیا قہر کیا تُو نے غضب تیرے پر آوے
۶۔ اب لے تو گیا ہے پر اُسے دیکھیو نادان　　پل میں نہ اُڑا تا وہ اگر بال و پر آوے

اِس دَور کے دُوسرے مشہور شاعر خواجہ میر دردؔ تھے۔ دہلی کے رہنے والے ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہُوئے۔ دِلّی کی ویرانی اور ابتری دیکھ کر جدھر جس کے سینگ سمائے بھاگ گیا۔ لیکن خواجہ صاحب نے دِلّی کو نہ چھوڑا۔ اور کہا۔ زبان کے مزے کون ترک کرے۔ اِن کا دِن رات شاعری کی نظر ہُوا۔ موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اپنی غزلیں گاتے تھے اور جھومتے تھے۔ ایک دفعہ اپنی نسبت فرمایا۔ کہ میں تو مور ہوں۔ جو اپنی خُوبصورتی پر ہی لٹّو ہوتا ہے۔ اور اُسے دیکھ دیکھ کر ناچتا ہے۔ میرزا سودا آپ کے کلام کی بہت قدر کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے۔ کہ ایک دفعہ کوئی شخص لکھنؤ سے دِلّی چلا۔ اور میرزا سودا سے بولا۔ کہ کوئی سندیسہ دینا ہو تو دیجئے۔ میرزا نے جواب دیا۔ بھئی میرا دِلّی میں کون ہے۔ ہاں خواجہ میر درد کی طرف جا نکلو۔ تو سلام دینا۔

ذرا خیال کیجئے۔ میرزا سودا جیسے شخص کو ساری دِلّی میں صرف ایک آدمی معلوم ہُوا۔ جسے اُنہوں نے سلام بھجوائی۔ اِس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اُن کی نِگاہوں میں خواجہ صاحب کی کیا وقعت تھی۔

خواجہ صاحب کی زبان میرؔ و سوداؔ سے مِلتی جُلتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

(۱)

جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا　　تُو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی — جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری — آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

(۲)

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
اُس نے قصداً بھی میرے نالہ کو — نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا
دل زمانہ کے ہاتھ سے سالم — کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
حال مجھ غم زدے کا جس تس نے — جب سُنا ہوگا رو دیا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں — کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
یک بہ یک نام لے اُٹھا میرا — جی میں کیا اُسکے آگیا ہوگا
میرے نالوں پہ کوئی دُنیا میں — بن لئے آہ کم رہا ہوگا
لیکن اُس کو اثر خدا جانے — نہ ہُوا ہوگا یا ہُوا ہوگا
دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا — آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

(۳)

مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے — زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے
خدا جانے کیا ہوگا انجام اِس کا — میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا — تیری آرزو ہے اگر آرزو ہے
کسو کو کسو طرح عزت ہے جگ میں — مجھے اپنے رونے سے ہی آبرو ہے
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر — جدھر دیکھتا ہوں وہی رو برو ہے

ناظرین دیکھیں۔ زبان کسقدر صاف ہے۔ اور خیالات کتنے پاکیزہ۔ سنہ ۱۱۹۹ھ میں فوت ہوئے۔

تیسرے شاعر جن کی شاعری نے اِس دَور کو سُورج کی طرح چمکا دیا۔ وُہ سیّد محمّد میر سوز تھے۔ پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ لیکن جب میر تقی نے بھی یہی تخلص کرنا شروع کر دیا۔ تو انہوں نے اُسے بدل کر سوز رکھ لیا۔ آپ کا مقامِ پیدائش دِلّی تھا۔ لیکن بزرگ بخارا کے رہنے والے تھے۔ اُن کی بھی شاعری بہت بلند پائے کی ہے (اور زبان ایسی خوبصورت ہے کہ بے اختیار ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ آپ میں ایک صفت اَور تھی۔ اَور وُہ یہ کہ (ایکٹنگ) میں کمال حاصل تھا۔ جب مشاعرے میں غزل پڑھتے تو مضمون کے ساتھ خود مضمون بن جاتے۔ ایک دفعہ آپ نے پڑھا۔

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے ــــ سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رُو ــــ ارے رے رے رے ارے رے رے رے ارے رے

چوتھا مصرع پڑھتے پڑھتے اِس طرح گرے گویا پریوں کو دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا۔ اَور بیہوش ہو کر گِر گئے۔ مشاعرے میں سنّاٹا چھا گیا۔ شاعری کا نمونہ یہ ہے:-

(۱)

بھلا رے عشق تیری شوکت و شاں ــــ بھائی میرے تو اُڑ گئے اوساں

ایک ڈر تھا کہ جی بچے نہ بچے ــــ دُوسرے غم نے کھائی میری جاں

بس غمِ یار ایک دن دو دن ــــ اِس سے زیادہ نہ ہوجیو مہماں

نہ کہ بیٹھے ہو پاؤں پھیلا کر ــــ اپنے گھر جاؤ خانہ آباداں

اَور تو اَور کہہ کے دو باتیں ــــ سوز کہلایا صاحبِ دیواں

(۲)

مِرا جان جاتا ہے یارو بچالو ــــ کلیجے میں کانٹا گڑا ہے نکالو

نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی — مجھے مار ڈالو مجھے مار ڈالو
خدا کیلئے میرے اے ہم نشینوں — وہ بانکا جو جاتا ہے اُسکو بلالو
اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے — تو دم کھا رہو کچھ نہ بولو نہ چالو
نہ آوے اگر وہ تمارے کہے سے — تو منت کرو گھیرے گھیرے منالو
کہو ایک بندہ تمارا مرے ہے — اُسے جان کندن سے چل کر بچالو
جلوں کی بُری آہ ہوتی ہے پیارے — تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

(۳)

دل کے ہاتھوں بہت خراب ہوا — جل گیا بل گیا کباب ہوا
اشک آنکھوں سے پل نہیں تھمتا — کیا بلا دل ہے دل میں آب ہوا
جن کو نت دیکھتے تھے اب اُن کا — دیکھنا بھی خیال و خواب ہوا
یار اغیار ہو گئے افسوس — کیا زمانے کا انقلاب ہوا

اُوپر جن تین شاعروں کا ذکر آچکا ہے۔ میر محمد تقی میر اُن تینوں سے بڑھ چڑھ کر ہوئے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے۔ کہ اُردو شاعری میں اُن کے جوڑ کا شاعر آج تک نہیں ہوا۔ بات سے بات نکالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ اور مضمون اِس حسن و خوبی سے باندھتے تھے۔ کہ انسان سناٹے میں آجاتا تھا لیکن مغرور بہت تھے۔ بات بات پر بگڑ جاتے تھے۔ اور شاعر تو اپنے سِوا کِسی کو سمجھتے ہی نہ تھے لکھنؤ میں کسی نے پوچھا۔ کیوں صاحب! آج کل شاعر کون کون ہے؟ میر صاحب نے جواب دیا۔ "ایک میں۔ دوسرے میرزا سودا۔"

"اور خواجہ میر درد؟"

"ہاں نصف شاعر وہ بھی ہیں۔"

"اور میر سوز کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
میر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا۔" کیا میر سوز بھی شاعر ہیں؟"
جی آخر نواب آصف الدولہ اُن کے شاگردوں میں ہیں۔"
"تو خیر پونے تین سہی۔ میں اُن کو پاؤ شاعر مان سکتا ہوں۔"

اِتنا ہی نہیں۔ اگر شیخ سعدیؒ کی غزل بھی پڑھی جائے تو سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک نوجوان غزل لے کر آیا۔ اور عرض کی۔ کہ میں شاگرد ہوا چاہتا ہوں۔ میر صاحب نے جواب دیا۔ فارسی میں کہہ لیا کرو۔ اُردو تم کو نہیں آئے گی۔ اِس قسم کی بیسیوں مثالیں ہیں۔ مگر طوالت کے خوف سے نظر انداز کی جاتی ہیں۔

میر تقی اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ اور باپ کی وفات کے بعد دِلی میں آگئے۔ جہاں اُس زمانہ میں خانِ آرزو کا طوطی بول رہا تھا۔ میر تقی اُن کے شاگردوں میں داخل ہوگئے۔ اور تھوڑے عرصہ میں ہی مشہور ہوگئے لیکن جب دِلّی کے رنگ ڈھنگ بدلے۔ تو میر تقی کو لکھنؤ جانا پڑا (ساری گاڑی کا کرایہ دے نہ سکتے تھے۔ اِس لئے ایک اور شخص کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دُور گئے ہوں گے۔ کہ اُس شخص نے کچھ بات کی۔ اُنہوں نے اُسکی طرف سے مُنہ موڑ لیا۔ اُس نے کہا۔ صاحب! آپ کیسے آدمی ہیں۔ جو بات چیت سے بھی کتراتے ہیں۔ میر تقی نے جواب دیا۔ آپ باتیں کرتے ہیں۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔ اُس شخص نے حیرت کی نگاہ سے اِنہیں دیکھا۔ اور پھر کوئی بات نہ کی۔ جب لکھنؤ پہنچے۔ تو شام ہو چکی تھی۔ میر تقی ایک سرائے میں اُترے۔ وہاں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ رہ نہ سکے اُسی وقت غزل لکھی۔ اور مشاعرہ میں جا پہنچے۔ ان کی وضع قدیمانہ دیکھ کر لوگ ہنسے۔ میر صاحب کو بہت بُرا

معلوم ہوا لیکن کیا کرتے۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اور ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ جب اُن کی باری آئی۔ تو لوگوں نے پوچھا۔ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے جواب دیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اُسکو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

کیا رقت خیز مضمون تھا۔ حسرت آمیز لیکن پُرغرور۔ لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اِسوقت تک ہنستے تھے۔ اب جاکر معلوم ہوا۔ کہ یہ وُہ شخص ہے۔ جسکی ذات پر اُردو کو فخر ہے۔ اور جس کے نام کے ہندوستان میں ڈنکے بج رہے ہیں۔ صُبح ہوتے ہوتے یہ خبر شہر میں اِس طرح پھیل گئی جس طرح جنگل میں آگ۔ نواب آصف الدولہ نے سُنا۔ تو دو سَو روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

کلام کا نمونہ یہ ہے :۔

(۱)

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے
ہم نے کیا چوٹ دِل پہ کھائی ہے

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دِل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

جِس مرض میں کہ جان جاتی ہے
دلبروں ہی کی وہ جُدائی ہے

مرگِ مجنوں سے عقل گُم ہے میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

(۲)

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بُہت عالم کرے گا غم ہمارا

پڑھیں گے لوگ رو رو شعر بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

زمین و آسماں زیر و زبر ہیں نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا
کسو کے بال برہم دیکھتے میرؔ ہوا ہے کام دِل برھم ہمارا

(۳)

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا کچھ ہمارا اِسی میں وارا تھا
کون لیتا تھا نام مجنوں کا جبکہ عہدِ جنوں ہمارا تھا
عشق بازی میں کیا موئے ہیں میرؔ آگے ہی جی اُنہوں نے ہارا تھا

(۴)

عِشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چَین گیا آرام گیا
دِل کا جانا ٹھہر گیا ہے صُبح گیا یا شام گیا

(۵)

وے دِن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سُوکھا پڑا ہے اب تو مُدّت سے یہ دو آبہ

(۶)

توبہ زاہد کی توبہ تِلّی ہے چلے بیٹھے تو شیخ چِلّی ہے
پگڑی اپنی سنبھالئے گا میرؔ اَور بستی نہیں یہ دِلّی ہے

چوتھا دَور

اِس کے بعد وہ شاعر آئے۔ جنہوں نے اُردو شاعری پر ظرافت کا رنگ چڑھایا۔ اَور اِسے ترقی کے مَیدان میں اَور آگے بڑھایا۔ اُن میں قابلِ ذکر تین ہیں۔ جرأت۔ اِنشا اَور مُصحفی۔ اِن کی محفلوں میں قہقہے بلند ہوتے تھے اَور ظرافت لوٹ پوٹ ہوتی جاتی تھی۔ زبانِ اُردو جسے میر و سودا نے پیتل سے

سونا بنایا تھا۔ ان کے وقت میں کھرا سونا بن کر چمکنے لگی۔ نئے محاورے بنے۔ نئے خیالات اُترے۔ اَور نئی بندشیں ایجاد ہوئیں۔ اب تک شاعر زبان کے ماتحت تھے۔ اِنھوں نے زبان کو اپنے موافق بنایا۔ اَور جدھر چاہا۔ موڑ لیا۔ بُزرگوں کی زبان میں کئی الفاظ اِنہیں کھٹکے۔ اُنہیں ترک کر دیا۔ مگر پھر بھی کچھ الفاظ رہ گئے جو اُن کے زمانہ میں بلادریغ استعمال ہوتے رہے۔ لیکن اب فصاحت اُن پر اعتراض کرتی ہے۔ مثلاً

ہمیشہ	کی بجائے	نت	اُدھر	کی بجائے	اُودھر
ذرا	″ ″	ٹک	مَیں نے	″ ″	مَیں
بہت	″ ″	زور	اُن کو	″ ″	اُنھوں کو
معشوق	″ ″	میاں	ہوا	کی بجائے (کبھی کبھی)	پوَن
جاتی ہیں	″ ″	جاتیاں	میں	کی بجائے	کے بیچ
جسم	″ ″	پِنڈا	جدھر	″ ″	جیدھر

۱۔ اِس دَور کے پہلے شاعر شیخ قلندر بخش جرأت تھے۔ دِلّی کے رہنے والے، میاں جعفر علی کے شاگرد۔ جوانی میں ان کے کلام کی وُہ دھاک بندھی۔ کہ آج کوئی امیر آ کر ساتھ لے جاتا۔ کل کوئی نواب اپنے گھر جا ٹھہراتا۔ اِسی طرح کئی سال گُذر گئے۔ لیکن جب ظرافت نے آنکھیں کھولیں۔ تو بصارت نے جواب دے دیا۔ عین جوانی میں اندھے ہو گئے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں میرؔ تقی بھی مَوجُود تھے۔ کہ جرأتؔ نے غزل پڑھی۔ اَور تڑپا دیا۔ ساری محفل پر وجد کا عالم طاری تھا۔ میاں جرأتؔ جوشِ سرور سے بیتاب ہو کر میرؔ تقی کے پاس جا پہنچے اَور بولے۔ گو آپ کے رُوبرو زبان کھولنا گُناہ سے کم نہیں۔ تاہم آپ نے میرا کلام سُنا؟ میر صاحب تیوڑی چڑھا کر چُپ ہو رہے۔ جُرأت نے پھر کہا۔ میر صاحب نے پھر ٹال دیا۔

آخر بولے۔ امر واقعہ تو یہ ہے۔ کہ تم کو شعر کہنے کا سلیقہ ہی نہیں۔ ہاں چوما چاٹی کا ذکر کرتے ہو کر لیا کرو۔ مگر اس سے ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ انہیں سچ مچ ہی شاعری کا مس نہ تھا۔ وُہ تو کہو۔ میر صاحب کی رائے تھی۔ جن کا دماغ ہمیشہ ہی عرش بریں پر رہتا تھا۔ لیکن یہ اُستاد آدمی تھے۔ جو کچھ کہتے تھے۔ اُس میں ایک شان پیدا کر دیتے تھے۔ اکثر غزلیں میر و سودا کی غزلوں پر کہی ہیں۔ اور اُن میں بعض مقامات پر شوخی کا رنگ دکھا کر اُن سے بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً میر صاحب کا شعر ہے:

اب کرکے فراموش تو ناشاد کرو گے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے

(یعنی اِسوقت تو ہماری پرواہ ہی نہ کرو گے۔ اور ایسا ظاہر ہوگا۔ کہ ہمیں بھول ہی گئے ہو۔ اور اِس طریق سے ہمیشہ ناراض کرو گے۔ لیکن یاد رکھو۔ جب ہم نہ رہیں گے۔ تب تمہیں ہماری یاد آئے گی۔ اور اپنے سلوک پر پچھتاؤ گے۔ اِسی خیال کو میرزا سودا نے اِس طرح ادا کیا ہے۔ ؎

جس روز کسی اَور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

(یعنی اِسوقت تو تمہیں ہماری پرواہ نہیں۔ جتنا چاہتے ہو ظلم کر لیتے ہو۔ اور ہم خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن تمہیں ہماری مستقل مزاجی کا علم اُسوقت ہوگا۔ جب کسی اور شخص پر ظلم کرو گے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے۔ کہ وُہ سہہ جائے۔ اُسوقت یاد کرو گے۔ کہ سودا کیا عجیب شخص تھا۔ جو اِسقدر ظلم سہتا تھا اور اُف نہ کرتا تھا) اب اِسی خیال کو جس طریقے سے میاں جرأت نے باندھا ہے۔ وُہ دیکھئے ؎

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

ظاہر ہے۔ کہ جو مزہ میاں جرأت کے اِس شعر میں ہے۔ وُہ سب سے بڑھ گیا ہے۔ کلام ملاحظہ ہو :۔

جادو ہے نگہ چھب ہے غضب قہر ہے مکھڑا — آفت قد ہے قیامت
غارتگرِ دیں وُہ بُتِ کافر ہے سراپا — اللہ کی قدرت
اٹکھیلی ہے رفتار میں گفتار کی کیا بات — ہر بات جگت ہے
اَور رنگ رُخِ یار ہے گویا کہ بھبھوکا — پھر تسپہ ملاحت
اُس اُبھرے ہوئے گات کی کیا بات جسے دیکھ — سب ہاتھ ملے ہیں
اَور ہائے رے ہر بات میں گردن کا وُہ ڈورا — ہے دامِ محبت
بھولے سے جو ہم نام لیں تو رُک کے کہیں یوں — اِس نام کو کم لو
پھر اِسپہ جو رُک جائیں تو جھٹ سے یہ کہہ دینا — بس دیکھ لی چاہت
کیا خاک رہیں چین سے بے چینی کے مارے — بس ہے یہ پرکھیا
ہم ہو گئے جس کے وُہ ہوا ہائے نہ اپنا — کیا کیجئے قسمت!

(۲)

جب یہ سُنتے ہیں کہ ہمسایہ میں آپ آئے ہوئے — کیا در و بام پہ پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
آپ سے میں تو نہ جاؤں پہ کروں کیا کہیں — دلِ بیتاب لئے جاتا ہے دوڑائے ہوئے
آج بھی اُسکے جو آنے کی نہ ٹھہری تو بس آہ — ہم وُہ کر بیٹھینگے جو دل میں ہیں ٹھہرائے ہوئے
مُردنی پھر گئی مُنہ پر مرے جن کی خاطر — رنگ رُو کیا وُہ پڑے پھرتے ہیں چمکائے ہوئے

(۳)

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چنپئی رنگ اُس کا اَور جوبن وُہ گدرایا ہوا
بات ہی اوّل تو وُہ مجھ سے نہیں کرتا کبھی — اَور جو بولے بھی ہے کچھ مُنہ سے تو شرمایا ہوا
جا کے پھر آؤں نہ جاؤں اُس گلی میں دوڑ دوڑ — پر کروں کیا میں نہیں پھرتا ہے دل آیا ہوا
وُہ کرے عزمِ سفر۔ تو کیجئے دُنیا سے کوچ — ہے ارادہ دل میں مُدّت سے یہ ٹھہرایا ہوا
جاؤں جاؤں کیا لگایا ہے ابھی بیٹھے رہو — ہوں میں اپنی زیست سے آگے ہی اُکتایا ہوا

کیا کہیں اب عشق کیا کیا ہم سے کرتا ہے سلوک دل پہ بیتابی کا اک پتلا ہے بٹھلایا ہوا
ہے قلق سے دل کی یہ حالت مری اب تو کہ میں چار سو پھرتا ہوں اپنے گھر میں گھبرایا ہوا

۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔

۲۔ اس دور کے شاعروں کے سرتاج سید انشا اللہ خاں انشا ہوئے ہیں۔ انکے حالات پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ کس غضب کے آدمی تھے۔ مسخرے کے مسخرے۔ اور شاعر کے شاعر۔ اور پھر طرّہ یہ کہ چھ سات زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اور ہر ایک میں لاجواب رہے ہیں۔ جس رنگ میں چاہتے ہیں بہ جاتے ہیں۔ اور جس طرف طبیعت آتی ہے چلے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک خاص خوبی یہ ہے۔ کہ مقامی رنگ جھلکتا ہے۔ کیا ضروری ہے۔ کہ گنگا جمنا کے ہوتے ہوئے جیحون سیحون، اور دشینت شکنتلا و ہیر رانجھا کی موجودگی میں ہندستان میں شیریں فرہاد کو گھسیٹا جائے۔

لیا گر عقل نے منہ میں دلِ بیتاب کا گٹکا
تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا

صنم خانہ میں جب دیکھا بتِ ناقوس کا جوڑا لگا ٹھاکر کے آگے ناچنے طاؤس کا جوڑا
ملے پارے سے بو ہڑتال کرکے راکھ کا جوڑا تو تانبے سرجی اگلیں کوئی نوتے لاکھ کا جوڑا
نہیں کچھ بھید سے خالی یہ تلسی داس صاحب جی لگایا ہے جو اک بھنورے سے تم نے آنکھ کا جوڑا
لپٹ کر کرشن جی سے رادھکا ہنسکر لگیں کہنے ملا ہے چاند سے ایلو اندھیرے پاکھ کا جوڑا

یہ سچ سمجھو کہ انشا ہے جگت سیٹھ اس زمانہ کا
نہیں شعر و سخن میں کوئی اُس کے ساکھ کا جوڑا

اے عشق اجی آؤ مہاراجوں کے راجہ ڈنڈوت ہے تم کو
کر بیٹھے ہو تم لاکھوں کروڑوں ہی سر چٹ اک آن میں چٹ پٹ

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر — اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
اے موسمِ خزاں لگے آنے کو تیرے آگ — بلبل اُداس بیٹھی ہے اک سوکھے ڈنڈ پر
راجہ جو ایک جوگی کے چیلے پہ غش ہیں آپ — عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لنڈ منڈ پر

دِل ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا — ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا
سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا — تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

اِس سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ اِنہوں نے کس طرح اپنے مُلک کی باتوں کو مذاقیہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ اور صرف اِتنا ہی نہیں۔ اُنہوں نے کئی نئے الفاظ ایجاد کئے۔ اور اُن کو اپنے کلام میں اِستعمال کیا۔ مثلاً

مثلث کا نام	تکڑا رکھا	رابط کے لئے	جوڑ استعمال کیا
مربع کا نام	چوکڑا رکھا	نِسبت کے لئے	ملاپ استعمال کیا
دور کے لئے	ہیر پھیر استعمال کیا	بدیہی کے لئے	ٹھیک ٹھیک

وغیرہ وغیرہ۔ مُدعا اُن کا یہ تھا۔ کہ زبان کو آسان بنایا جائے۔ افسوس ہے۔ کہ آج کل پھر وُہی ہوا چلنے لگی ہے۔ اور اُردو میں موٹے موٹے عربی اور ترکی کے الفاظ داخل کئے جا رہے ہیں۔ جن سے زبان کی قُدرتی خُوبصورتی میں فرق آگیا ہے۔ انشا نے ۵۰ صفحے کی ایک کہانی لکھی تھی۔ جس میں کوئی لفظ عربی فارسی کا نہیں آنے دیا۔ مگر باوجود اِس کے ایسی خوبصورت ہے۔ کہ پڑھ کر مزا آتا ہے۔ مثلاً

"اب یہاں سے کہنے والا یوں کہتا ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان چڑھی۔ کہ کوئی ایسی کہانی کہیئے۔ جسمیں ہندی چھُٹ اور کسی بولی کی پُٹ نہ ملے۔ تب میرا جی پھُول کر کلی کے رُوپ کھِلے۔ اپنے ملنے والوں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پُرانے سر ہلا کر، گلا پھُلا کر، لال لال آنکھیں پتھرا کر کہنے لگے۔ یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ میں نے کہا۔ میں کچھ ایسا بڑبولا نہیں۔ جو رائی کو پربت کر دکھاؤں۔ مجھ سے نہ ہوسکتا۔ تو بھلا منہ سے کیوں نکالتا"

گھوڑے پہ اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں　　کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی　　کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

ایکدفعہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ آپسمیں چوٹیں ہونے لگیں۔ جب شمع ان کے آگے آگئی تو انہوں نے یہ غزل پڑھی :-

اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے　　کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے
ہیں وہ جبرتی کہ گروہِ حکما سب　　چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے
بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں　　بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے
وہ مارِ فلک کاہکشاں نام ہے جس کا　　کیا دخل جو بل کھا کے کرے خوں مرے آگے

ان کی موت ۱۲۳۳ھ میں ہوئی :-

۴۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہہ کے رہنے والے تھے لیکن جوانی میں دلی آگئے اور شعر و سخن میں مصروف ہوگئے۔ مگر جب دلی اجڑی تو انہوں نے بھی لکھنؤ کا راستہ لیا۔ ہر چند کہ دلی ان کا وطن نہیں۔ لیکن پھر بھی کہتے ہیں :-

دلی کہے ہیں جس کو زمانہ میں مصحفی　　میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

سید انشا کے ساتھ ان کی بہت چھیڑیں ہوئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ کس قسم کے آدمی ہوں گے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک تھی۔

لیکن خود کسی کے شاگرد نہ تھے۔ چھ دیوان اُردو میں لکھے ہیں۔ ایک فارسی میں۔ ظاہر ہے۔ کہ اُستاد آدمی تھے ورنہ اِتنا کچھ کیسے لکھ جاتے۔ کلام کا نمونہ دیکھئے:-

(۱)

پیری سے ہو گیا یوں اِس دل کا داغ ٹھنڈا | جس طرح صبح ہوتے کر دیں چراغ ٹھنڈا
سرگرمِ سیرِ گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا | نزلہ سے ہو رہا ہے آپ ہی دماغ ٹھنڈا
بُلبُل کے گرم نالے جب سے سُنے ہیں اُس نے | دیوارِ گلستاں پر بولے ہے [illegible] ٹھنڈا
گرمی کی رُت ہے ساقی اور اشک بلبلوں نے | چھڑکاؤ سے کیا ہے سب صحنِ باغ ٹھنڈا

(۲)

جو گُستاخانہ کچھ اُس سے میں بولا | تو بس ابرو نے تیغا وو ہیں تولا
چُنے عاشق نہ کیوں اُسکے ممولے | کہ چشمِ شوخ ہے اُس کی ممولا
یہ وُہ گلشن ہے جِس میں غم کے مارے | تبسّم سے کلی نے مُنہ نہ کھولا
کہیں ملتے ہیں ایسے مصحفی یار | نہ آوے دِل کے مرنے کا ملولا

(۳)

یار بِن باغ سے ہم آتے ہیں دُکھ پائے ہوئے | اشک آنکھوں میں بھرے ہاتھ میں گُل کھائے ہوئے
آنکھ سیدھی نہیں کرتا کہ مقابل ہو نگاہ | آرسی ناز سے دیکھے ہے وُہ شرمائے ہوئے
اُس کے کوچے سے جو اُٹھ جاتے ہیں ہم دیوانے | پھر اُنہی پاؤں چلے جاتے ہیں بورائے ہوئے

پانچواں دَور تخیل

یہ وُہ دَور تھا جس میں Imagination انتہائی بلندی پر جا پہنچا اور اصلیت و سادگی دونوں کی طرف توجہ نہیں رہی۔ اِس میں شک نہیں کہ Imagination شاعری کے لئے لازمی شے ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب بھی

نہیں کہ Imagination اتنا بلند ہو اور اصلیت و سادگی سے اِسقدر دُور ہو کہ ایک ایک شعر پر ایک آدمی گھنٹوں بیٹھا سوچتا رہے۔ اور تب بھی سمجھ نہ سکے کہ شاعر کا مطلب کیا تھا۔ بلکہ ایک فلاسفر کا تو قول ہے کہ عمدہ شاعری وُہ ہے جو فوراً سمجھ میں آجائے۔ اور جس کے سُنتے ہی سُننے والا کہہ دے واہ واہ کیا سچ کہا ہے۔ یعنی اُس کے خیال کے مطابق شاعری کے لئے تین صفتوں کا ہونا لازمی ہے۔ اوّل یہ کہ آسان ہو۔ اور اُسے ہر کوئی سمجھ سکے۔ دُوسرے اُس میں Imagination ہو۔ انوکھا پن ہو کہ سُننے والے کے مُنہ سے بے اختیار واہ وا نکل آئے۔ اور تیسرے یہ کہ اُس کی بُنیاد راستی پر ہو۔ اور یہ معلوم ہو کہ شاعر نے واقعات کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اِس خیال سے اُردو شاعری کے پہلے اور دُوسرے دَور کی شاعری چوتھے اور پانچویں دَور کی نسبت زیادہ قابلِ قدر ہے۔ وجہ یہ کہ اُسوقت کے شاعروں نے جو کچھ دیکھا ہے وُہ کہدیا ہے اور جو کچھ محسوس کیا ہے۔ اُسی پر قلم چلایا ہے۔ لیکن چوتھے اور پانچویں دَور کے شاعروں نے دیکھا کہ سادگی اور اصلیت کی صفات تو بزرگوں کے کلام میں موجود ہیں۔ اِس لئے اُن راستوں پر چلنے سے نہ اپنے آپ کو تسلی ہوگی نہ اوروں کو مزہ آئیگا۔ پس اُنہوں نے Imagination کی طرف توجہ کی۔ اور اتنے بلند اُڑے کہ آسمانِ خیال کا تارہ بن گئے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ شاعری میں خیال تو آگئے۔ لیکن سادگی اور اصلیت دونو غائب ہو گئے۔ شاید اِسی لئے بعض حکیموں نے شاعری کو magic lantern جادو کی لالٹین سے تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ وُہ ہمیشہ تاریکی میں لُطف دیتی ہے۔ اِدھر روشنی ہُوئی۔ اُدھر اُس کا وجود بیکار۔ اِسی طرح وُہ کہتے ہیں۔ کہ شاعری اُس زمانے میں ہو سکتی ہے۔ جب مُلک غیر مہذب ہو اور زیورِ علم سے آراستہ نہ ہو۔ لیکن

یہ رائے اتنی درست نہیں جتنی خوبصورت ہے۔ وجہ یہ کہ شاعری کا مقصد نہ تو یہ ہے کہ دماغوں کو پیچدار خیالوں میں اُلجھایا جائے۔ نہ یہ کہ اُن کے سامنے تصویریں رکھی جائیں۔ بلکہ اصل میں شاعری کا مطلب یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے دلوں پر اثر کیا جائے۔ لیکن جہاں پڑھنے والا لغات ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔ وہاں اثر کے لئے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور وہ شاعری شاعری نہیں رہتی۔ یہ دکھانے کیلئے کہ انتہائی Imagination سے کس طرح شعر un-natural بن جاتا ہے۔ ذیل میں ہم چند مثالیں دیتے ہیں۔ اُستاد غالب کا ایک مصرعہ ہے۔

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اب سوچئے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ صرف صحرا میں گھومنے کا خیال آنے سے ہی صحرا میں آگ لگ جائے۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ خیال میں نزاکت ہے۔ لیکن اس میں اتنا غیر قدرتی پن ہے۔ کہ دل میں کھٹکنے لگتا ہے۔ اسی طرح امیر مینائی لکھتے ہیں۔ ؎

کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخِ گُل سے کوئی پھول　　آتشِ گل سے پڑے چھالے تمارے ہاتھ میں

نزاکت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ مگر یہ ناممکن ہے اور قطعی ناممکن ہے کہ صرف پھول توڑنے سے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں۔ اور ساتھ ہی کہا

نازکی ختم ہے اُن پہ جو یہ فرماتے ہیں　　فرشِ مخمل پہ مرے پاؤں چھلے جاتے ہیں

یہ بھی ناممکن ہے کہ مخمل کے فرش پر پاؤں چھِل جائیں۔ اسی طرح اُستاد ذوق فرماتے ہیں۔

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری　　بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا

یعنی جس جگہ پر تیری سرد مہری (بے پرواہی) کا شہید دفن ہے۔ وہاں کافور کا

درخت اُگ آتا ہے۔ کیونکہ سرد مہری میں لفظ سرد موجود ہے۔ اور کافور کی تاثیر بھی سرد ہوتی ہے۔ محض لفظ ہی لفظ ہیں۔ حضرت ناسخ کا خیال دیکھیئے :۔

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیئے

(یعنی دکھلایا یہ ہے۔ کہ اُن کی جُدائی میں میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہوں۔ لیکن کون مانے گا کہ یہ کمزوری اِس حد تک جا پہنچی۔ کہ آنجناب نظر آنے سے بھی رہ گئے۔ لیکن وہ اِس بات کو تاڑ گئے ہیں۔ کہ میرا عاشق چاہے دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اِس بستر پر ہے ضرور۔ اِسی لئے تو ہنستے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ بستر کو جھاڑ کر دیکھو۔ ابھی مل جاتے ہیں۔ گویا سوئی بن گئے۔) اسے قدرتی شعر کون کہیگا۔ لیکن ابھی اور دیکھیئے اِسی جُدائی نے شاہ نصیر کا جو حال کیا ہے۔ وہ سب سے بڑھ گیا ہے۔

یہ مجنوں ہے نہیں آہو ہے لیلیٰ پہن کر پوستیں نکلا ہے گھر سے

جسے تو سینگ سمجھے ہے یہ ہیں خار لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

(یعنی اے لیلیٰ جسے تو ہرن سمجھ رہی ہے۔ وہ ہرن نہیں۔ بلکہ تیرا عاشق مجنوں ہے۔ اب کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہرن کا چمڑہ اور آدمی کا چمڑہ بالکل جُدا قسم کا ہوتا ہے۔ مجنوں کا چمڑہ ہرن کے چمڑے کی قسم کا کیسے بن گیا۔ جواب دیا ہے۔ کہ مجنوں نے پوستین پہنی ہوئی ہے۔ دوسرا سوال یہ ہوتا ہے۔ کہ مجنوں کے سر پر سینگ کیسے نکل آئے۔ جواب دیتے ہیں۔ کہ یہ سینگ نہیں بلکہ کانٹے ہیں۔ جو بیابانوں میں گھومتے ہوئے پاؤں میں لگے اور سر سے نکل گئے۔ اتنے لمبے لمبے کانٹے عالمِ خیال میں ہی ہو سکتے ہیں۔ ورنہ عام دُنیا والے تو ان پر یقین نہیں کرتے) اُستاد داغ کا ایک شعر ہے۔

رُخِ روشن کے آگے شمع کو رکھ کر یہ کہتے ہیں اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

یعنی اُن کو اپنے حُسن پر اِسقدر گھمنڈ ہے۔ کہ گال کے سامنے چراغ رکھ کر کہتے ہیں کہ دیکھیں پروانہ اُسطرف جاتا ہے۔ یا اِدھر آتا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں شاعر کو یقین ہے۔ کہ اُن کے گال میں چراغ کی نسبت زیادہ روشنی ہے۔ اِسلئے پروانہ ضرور دھوکا کھا جائے گا۔ یہ بھی صرف خیال ہی ہے۔ لیکن اِس سے یہ مطلب نہیں کہ اِس دَور میں جو شاعر ہوئے ہیں۔ اُن کی تمام و کمال شاعری تخیّل کی نذر ہو گئی ہے۔ اُن کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ جو پُورے طور پر natural کہے جا سکتے ہیں۔ اور جن کی خوبیوں کو دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم اِس دَور کے شاعروں کی شاعری میں سے کچھ انتخاب نیچے دیتے ہیں۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ اُستاد غالبؔ کا شعر ہے۔ اور بالکل نیچرل ہے۔ کیونکہ بیماری میں دوستوں کا آنا بھی قُدرتی ہے۔ اور یہ دوستوں کو دیکھ کر مریض کے چہرے پر رَونق آجانا بھی قُدرتی ہے۔ اِس لئے کہتے ہیں۔ کہ جب میرے مُنہ پر اُن کو دیکھ کر رَونق سی آجاتی ہے۔ تو وُہ سمجھ لیتے ہیں۔ کہ اب بیمار کا حال اچھا ہے۔ اُستاد ذوقؔ لکھتے ہیں:۔

رہتا ہے اپنا عشق میں یُوں دل سے مشورہ جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

یہ بھی نیچرل ہے۔ کیونکہ عشق میں اور عشق میں ہی نہیں بلکہ ہر ایک مُشکل میں اِنسان اپنے دِل سے صلاح مشورہ کرتا ہے۔ اور اُس سے اِس طرح صلاح مانگتا ہے گویا کہ وُہ اُس کا دوست ہے۔ اُستاد مومنؔ کہتے ہیں:۔

تُم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا

یہ بھی قُدرتی ہے۔ کیونکہ جس سے زیادہ تعلق بڑھ جاتا ہے۔ اور جس کا تصوّر

ہر وقت بندھا رہتا ہے۔ وُہ تنہائی میں فوراً یاد آجاتا ہے۔ اور اُس کے یاد آتے ہی اُس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اِسی لئے کہتے ہیں کہ جب کوئی دُوسرا میرے پاس نہیں ہوتا۔ اُس وقت گویا تم میرے پاس ہوتے ہو۔ ناسخ صاحب کا شعر ہے :-

اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو

یعنی جب کوئی روتے روتے چُپ ہو جاتا ہے۔ تو ٹھنڈی آہیں بعد میں بھی جاری رہتی ہیں۔ اِسی مضمون کو لیکر کہتے ہیں۔ کہ جب آنسو تھم جاتے ہیں تو آہیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی مثال بھی دی ہے۔ کہ جس طرح پانی خشک ہو جاتا ہے تو ہوا پیدا ہو جاتی ہے۔ میر خلیق کا ایک شعر ہے :-

اشک جو چشمِ خُونفشاں سے گرا تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا

یعنی جس طرح آسمان سے گر کر ستارہ غائب ہو جاتا ہے۔ اُسی طرح آنکھ سے گر کر آنسو بے نشان ہو جاتا ہے۔ بعد میں نہ ستارہ مِل سکتا ہے۔ نہ آنسو کا پتہ لگتا ہے۔ خواجہ آتش لکھتے ہیں :-

آنکھیں نہیں ہیں چہرہ پہ تیرے فقیر کے دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کیلئے

یہ بھی نیچرل شعر ہے۔ کیونکہ جب کسی کو کسی سے عشق ہو جاتا ہے۔ تو آنکھیں بے رونق ہو جاتی ہیں۔ اور اُن میں وحشت آجاتی ہے۔ اُسی وحشت کی بنا پر کہا ہے۔ کہ تیرے فقیر کے چہرے پر جو آنکھیں ہیں۔ اُنہیں آنکھیں نہ سمجھ۔ بلکہ وُہ تو تیرے دیدار کی بھیک مانگنے کے لئے دو ٹھیکرے ہیں۔ پہلے مصرعہ میں لفظ فقیر اور دُوسرے میں بھیک نے ایک خُوبی پیدا کر دی ہے۔ اُستاد داغ فرماتے ہیں :-

مُصیبت کوئی دن میں بھر جائیگی چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائیگی

رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں — یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی؟

دو خیال ہیں اور دونو ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ لیکن دونو قدرتی ہیں اور حرف بحرف سچ ہیں۔ پہلا خیال یہ ہے۔ کہ ہوا و ہوس کب تک رہے گی۔ آخر اسے آندھی سے مشابہت دی جاتی ہے۔ اور کونسی آندھی ہے۔ جو بند نہیں ہو جاتی۔ دوسرا خیال یہ ہے۔ کہ مرتے دم تک خواہشیں ساتھ رہیں گی۔ کیونکہ انسان کی نیت کبھی بھرنے میں نہیں آتی۔

اس دور کا حال ختم کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ناظرین کے سامنے ایک ہی مضمون پر مختلف شاعروں کے اشعار رکھ کر اُن کو یہ دیکھنے کا موقعہ دیں کہ کس طرح ابتدا میں شاعری سادہ ہوتی ہے۔ اور بعد میں پیچیدہ بنی جاتی ہے

پہلی مثال ۔ مضمون یہ ہے۔ کہ معشوق کو دیکھ کر عاشق کے دل میں کیا خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اسے پہلے دور کا شاعر مُبارک شاہ آبرو یوں ادا کرتا ہے :-

نین سوں نین جب ملائے گیا — دل کے اندر مرے سمائے گیا

بالکل سادہ طریق ہے۔ کہ جب اُسکی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں۔ تو اُسکی تصویر دل میں کھب گئی۔ اسی مضمون کو دوسرے دور کا کوئی میرزا شاہ حاتم یوں باندھتا ہے :-

کالوں کا یہ سخن مُدت سوں مجھ کو یاد ہے — جگ میں بے محبوب جینا زندگی برباد ہے

صاف ظاہر ہے۔ کہ مضمون پیچیدہ ہوگیا تیسرے دور کا شاعر اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ چنانچہ خواجہ میر درد کہتے ہیں :-

جان سے ہو گئے بدن خالی — جس طرف تُو نے آنکھ بھر دیکھا

چوتھے دور کے مشہور شاعر سید انشا فرماتے ہیں :-

اپنے داغِ جگر میں سوجھی ہے — مجھ کو اُس نازنین کی تصویر

یعنی معشوق کو دیکھ کر جگر میں داغ پیدا ہوگیا۔ اور اُس داغ میں تصویر نظر آنے لگی۔ مگر پانچویں دور کے شاعر اِسی مضمون کو Imagination سے آراستہ کرتے ہیں :-

دِل اُس بُت پہ شیدا ہُوا چاہتا ہے　　خُدا جانے اب کیا ہُوا چاہتا ہے

دُوسری مثال۔ یار کی جُدائی کو پہلے دور کے پہلے شاعر ولی یُوں بیان کرتے ہیں :-

ہے جُدائی میں زندگی مُشکل　　آ جُدائی نہ کر خُدا سوں ڈر

کوئی ہیر پھیر نہیں۔ کوئی مُشکل نہیں۔ صاف کہہ دیا۔ کہ تُمہارے بغیر زندگی کتنی مُشکل ہے۔ خُدا سے ڈر اور میرے پاس آجا۔ کیوں دُکھ دیتا ہے۔ لیکن دُوسرے دور کے شاعر شاہ حاتم کہتے ہیں :-

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کُوٹا ہے　　رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لُوٹا ہے

اب دیکھئے تیسرے دور کے شاعر میرزا سودا اِسی مضمون کو کیسے پیچیدہ طریق سے ادا کرتے ہیں :-

دِل کے پُرزوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہُوں　　کُچھ علاج اِن کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

یعنی جُدائی کے مارے دِل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے اُسکے پُرزوں کو بغل میں دبائے پھرتا ہُوں۔ کہ شاید شیشہ گر اُنہیں جوڑ سکیں۔ دُوسرے دور میں شاہ حاتم سینہ کوٹتے رہے تھے۔ لیکن دِل ٹُوٹا نہ تھا۔ یہاں ٹُکڑے ٹُکڑے ہوگیا۔ اور چوتھے دور میں یہ حال ہوگیا۔ کہ

ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں میری فریاد کے ٹُکڑے

فریاد کے ٹُکڑے ہوا میں اُڑنے لگ گئے۔ اور پانچویں دور میں تخیُّل کے زور سے عالمِ خواب پر بھی دخل کر لیا۔ اور سرِ بازار دعوے کرنے لگے۔ کہ ہمارا معشوق خواب میں بھی اکیلا نہیں آتا۔ اُستاد ذوق لکھتے ہیں :-

کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

تخیل کا انتہائی درجہ ہے۔ لیکن بالکل غیر قدرتی۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے۔ کہ معشوق خواب میں بھی ضرور ہی کسی کے ساتھ دکھائی دے۔

چھٹا دور

جب ناسخ۔ آتش۔ مومن۔ ذوق اور غالب اپنے تخیل کے زور سے بلندی میں اُڑ چکے۔ تو وہ وقت آیا۔ جب شاعروں نے اُوپر کی بجائے آگے کی طرف قدم بڑھایا۔ اور عشقیہ مضامین کو چھوڑ کر دوسرے مضامین پر طبع آزمائی شروع کی۔ اِس وقت تک اُردو شاعری محض حسن و عشق کے چرچوں اور گل و بلبل کے افسانوں تک محدود تھی۔ نظیر اکبرآبادی نے عام مضامین لیکر خیالات کے دریا بہا دیئے۔ اور شاعری کا رُخ پلٹ دیا۔ اِس کے بعد خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے اِس میدان میں ایک نیا راستہ ڈھونڈا۔ اور قومی شاعروں کی طرف توجہ کی نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج کل جو شاعر اُٹھتا ہے اُسی راستے پر چلتا ہے۔ جو حالی صاحب تیار کر گئے ہیں۔ اِس دَور کے شاعر کون کون سے ہیں۔ اور اُن کی شاعری کس قسم کی ہے۔ یہ اگلے صفحات سے ظاہر ہوگا +

نومبر ۱۹۲۱ء

سُدرشن

اظہارِ شکریہ

مجھے اِس کتاب کی تیاری میں مولوی محمد حسین صاحب آزاد
کی مشہور کتاب آبحیات۔ مولانا حالی صاحب کی شہرۂ آفاق
تصنیف مُقدمہ شاعری۔ اور لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے
کی قابلِ قدر تالیف خمخانۂ جاوید سے بہت امداد ملی ہے
اسلئے میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ علاوہ ازیں
جن جن شیریں بیان شاعر حضرات کے کلام منتخبہ سے
میں نے اِس کتاب کو زینت دی ہے۔ اُن سب کا
میں تہِ دل سے مشکور ہوں +

سُدرشن

فہرستِ مضامین

گلدستہ سخن

شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی

تعارف

سنہ [illegible]ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ آپ غالباً سب سے پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے غزلوں کے زمانہ میں نظموں کی طرف رجوع کیا۔ اور معمولی معمولی عنوان لیکر مضامین کے دریا بہائے گو ایک ایسا گروہ بھی ہے۔ جو نظیر کی شاعری کا قائل ہی نہیں تاہم ایسی جماعت بھی ہے جسے نظیر کے ساتھ دلی عقیدت ہو اور جن کا بجا دعوے ہے۔ کہ ایشیائی شاعری میں نیچرل شاعری کا پیوند لگانیوالا آگرے کا یہی سخنگو تھا۔ جسکی داستان کی داد کی محنتوں کی آجتک قدر نہیں کی گئی +

کرشن کنھیا کی بانسری

جب مُرلی دھر نے مُرلی کو اپنی ادھر دھری　　کیا کیا پریم پریت بھری اسمیں دُھن بھری
لَے اُسمیں رادھے نام کی ہر دم بھری کھری　　لہرائی دھن جو اُسکی اِدھر اور اُدھر دری
سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنھیا نے بانسری!

کتنے تو اُسکے سننے سے دھن ہو گئے دُھنی　　کتنوں کی سُدھ بسر گئی جس دم وہ دھن سُنی
کتنوں کی من سے کل گئی اور بیاکلی چُنی　　کیا نر سے لیکے ناریاں کیا کوڑھ کیا گُنی
سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنھیا نے بانسری!

جس آن کانھ جی کو وہ بنسی بجاؤنی　　جس کان میں وہ آونی واں ہی بھلاؤنی
ہر من کی ہو کے موہنی اور چت لبھاؤنی　　نکلی جہاں دھن اُسکی وہ میٹھی سہاؤنی
سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنھیا نے بانسری!

جس دن سے اپنی بنسی وہ سری کرشن نے بجی　　اس سانورے بدن پہ نپٹ آن کر سجی
[illegible] بھلایا آپ کو ناری نے سدھ تجی　　نکلی اُدھر سے آکے وہ بنسی جدھر بجی
سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنھیا نے بانسری

گوالوں میں نند لال بجاتے وہ جس گھڑی　　گوپین دھن اُسکی سُننے کو رہجاتیں سب کھڑی

گلیوں میں جب بجاتے تو وہ اُسکی دُھن وہ چڑھی لے لے کے اتنی لہر جہاں کان میں پڑی

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنھیا نے بانسری!

بنسی کو مُرلی دھر جی بجانے گئے جدھر پہلے دھن اُسکی روز ہر اک دل میں کر اثر

سنتے ہی اُسکی دھن کو حلاوت اُدھر اُدھر سُر جھنگ آ درنے کی دھنیں دل سے بھولکر

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنھیا نے بانسری

بن میں اگر بجاتے تو واں بھی یہ اُسکی چاہ کرتی دُھن اُسی پنچھیے بوہی کے دل میں

بستی میں جو بجاتے تو کیا شام کیا پگاہ پڑتی ہی دُھن وہ کان میں اُمڈ آ پریم چاہ

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنھیا نے بانسری

کتنے تو اُسکی دُھن کے لئے رہتے بیقرار کتنے لگائے کان اُدھر رکھتے بار بار

کتنے کھڑے ہو راہ میں کر رہتے انتظار آتے جدھر بجاتے ہوئے شیام جی مراد

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنھیا نے بانسری

دھن کی آمد بانسری کی میں کیا کیا کہوں صفت لے اُسکی سُر کی ہو ہی دُھن اُسکی چلبتا

اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا بچن کیا جل پون نظیر پکھیرو دو کیا ہرن

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنھیا نے بانسری

کوڑی

کوڑی ہے جنکے پاس وہ اہل یقین ہیں کھانے کو اُنکے نعمتیں سو بہترین ہیں
کپڑے بھی اُنکے تن میں نہایت مہین ہیں سمجھیں ہیں وہ جو اسکو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی بغیر سوتے ہیں خالی زمین پر کوڑی ہوئی تو رہنے لگے شہ نشین پر
پٹکے سنہرے بندھ گئے جامونکی چین پر موتی کے گچھے لگ گئے گھوڑونکی زین پر
کوڑی کے سب جہانمیں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی نہو تو پھر یہ جھمیلا کہاں سے ہو ہتھنا نہ فیلخانہ طویلا کہاں سے ہو
مُنڈوائے سر فقیر کا چیلا کہاں سے ہو کوڑی نہو تو سائیں کا میلہ کہاں سے ہو
کوڑی کے سب جہانمیں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کاندھے پہ تیغ دھرتے ہیں کوڑی کیواسطے آپس میں خون کرتے ہیں کوڑی کیواسطے
یاں تک تو لوگ مرتے ہیں کوڑی کیواسطے کیوں جان دے گذرتے ہیں کوڑی کیواسطے
کوڑی کے سب جہانمیں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

گالی و مار کھاتے ہیں کوڑی کیواسطے شرم و حیا اُٹھاتے ہیں کوڑی کیواسطے

دنیا کو چھان آئے ہیں کوڑی کیواسطے   مسجد کو دم میں ڈھاتے ہیں کوڑی کیواسطے

کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں!

شاہی محل اُٹھاتے ہیں کوڑی کے زور سے   پکے کنوئیں کھداتے ہیں کوڑی کے زور سے
پُل اور سرا بناتے ہیں کوڑی کے زور سے   باغ و چمن اُگاتے ہیں کوڑی کے زور سے

کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کیا مفلس اور فقیر سے تا شاہ اور وزیر   کوڑی وہ دلربا ہے کہ ہے سب کے دلپذیر
دیتے ہیں جان کوڑی پہ طفل و جوان و پیر   کوڑی عجب ہی چیز ہے میں کیا کہوں نظیر

کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگیں ہیں
کوڑی نہو تو کوڑی کے سب تین تین ہیں

فقیروں کی صدا

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائیگی بابا   دُکھ اسمیں تری رُوح بہت پائیگی بابا
ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائیگی بابا   دولت جو ترے یاں ہی نہ کام آئیگی بابا

پھر کیا تجھے اللہ سے ملوائیگی بابا

دولت جو ترے پاس ہے رکھ یاد تو یہ بات   کھا تو بھی اور اللہ کی کر راہ میں خیرات
دینے سے اسی کے ترا اونچا رہے گا ہات   اور یاں بھی تری گذریگی سو عیش سے اوقات

اور واں بھی تجھے سیر یہ دکھلائیگی بابا

واں کی تو مشکل کبھی اٹکی نہیں رہتی　　چڑھتی ہے پہاڑ و نکے اوپر ناؤ سخی کی
اور تو نے بخیلی سے اگر جمع اسے کی　　تو یاد یہ رکھ بات کہ جب آویگی سختی
خشکی میں تری ناؤ یہ ڈبوائیگی بابا

یہ تو نہ کسی پاس رہی ہے نہ رہے گی　　جو اور سے کرتی رہی وہ تجھسے کریگی
کچھ شک نہیں اسمیں جو بڑھی ہے سو گھٹیگی　　جبتک تو جیئے گا تجھے یہ چین نہ دیگی
اور مرتے ہوئے پر یہ غضب لائیگی بابا

جب موت کا ہو دیگا تجھے آن کے دھڑکا　　اور نزع تری آن کے دم لیویگی بھڑکا
جب اسمیں جو اٹکے گا نہ دم نکلیگا پھڑکا　　کوئیں میں روپے ڈالکے جب دیوینگے کھڑکا
تب تن سے تری جان نکلجائیگی بابا

تو لاکھ اگر مال کے صندوق بھریگا　　ہے یہ تو یقیں آخرش اک دن تو مریگا
پھر بعد ترے اسپہ جو کوئی ہاتھ دھریگا　　وہ ناچ مزا دیکھیگا اور عیش کریگا
اور روح تری قبر میں چلائیگی بابا

اسکے تو وہاں ڈھولک و مردنگ بجیگی　　اور روح تری قبر میں حسرت سے جلیگی
وہ کھا دیگا اور تیرے تئیں آگ لگیگی　　تا حشر تری روح کو پھر کل نہ پڑیگی
ایسا یہ تجھے گور میں تڑپائیگی بابا

گر ہوش ہے تجھ میں تو بخیلی کا نہ کر کام　　اس کام کا آخر کو بدی ہوتا ہی انجام
ٹھوکر کا کوئی نکلے کوئی دیویگا دشنام　　زنہار نہ لیگا کوئی ہر صبح ترا نام
پیزار اِن ترے نام پہ لگوائیگی بابا

کہتا ہے نظیر اب جو یہ باتیں تجھے ہر آن　　گر مرد ہے عاقل تو اسے جھوٹ تو مت جان

سن غور سے کر تجھ پہ قارونکے ذرا دھیان　　جیسا ہی اُسے اِس نے کیا خوب پریشان

ویسا ہی مزا تجھ کو بھی دکھلائیگی بابا

آٹے دال کا بیان

کیا کہوں یارو میں نقشہ خلق کے احوال کا　　اہل دولت کا چلن یا مفلس و کنگال کا

یہ بیان تو واقعی ہے ہر کسیکے حال کا　　کیا تونگر کیا غنی کیا پیر اور کیا بالکا

سب کے دلکو فکر ہے دن رات آٹے دال کا ــــ کی ہونا چاہیے

گر نہ آٹے دال کا اندیشہ ہوتا سدِ راہ　　تو نہ پھرتے ملک گیری کو وزیر و بادشاہ

ساتھ آٹے دال کے ہے حشمت و فوج و سپاہ　　جابجا گڑھ کوٹ سے لڑتے ہوئے پھرتے ہیں آہ

سب کے دلکو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

گر نہ آٹے دال کا ہوتا قدم یاں درمیاں　　منشی و میر و وزیر و بخشی و نواب و خاں

جاگتے دربار میں کیوں آدھی آدھی رات ہاں　　کیا عجب نقشہ پڑا ہے آہ کیا کہیئے میاں

سب کے دلکو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

اپنے عالم میں یہ آٹا دال بھی کیا فرد ہے　　حسن کی قصرِ شہی سب اسکے آگے گرد ہے

عاشقوں کا بھی اسی کے عشق سے منہ زرد ہے　　کیا کہیئے کہ کیا وہ مرد کیا نا مرد ہے

سب کے دلکو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

دلبروں کی چشم ابرو زلف کیا خط خال ہے　　ناز کی شوخی ادائیں حسن لالون لال ہے

کیا گرستی ہے کافر کیا ٹھمکتی چال ہے غور کر دیکھا ہے جو کچھ ہے سو آٹا دال ہے

سب کے دلکو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

اب جنہیں اللہ نے یاں کر دیا کامل فقیر وہ تو بے پرواہ سخی داتا ہیں آپ ہی دلپذیر

اور جتنے ہیں وہ سب ہیں دال آٹے کے اسیر اُن غریبوں کی بھی اب یہ شکل ہیگی اے نظیر

سب کے دلکو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

بنجارہ نامہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ

کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہجاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

گر تو ہی لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے

کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے کیا داکھ منقےٰ سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہجاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاویگا یا سود بڑھا کر لاویگا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا

قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراویگا دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آویگا

سب ٹھاٹھ پڑا رہجاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے

جب نایک تن سے نکلگیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون پڑی ڈھلجاویگی　　اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاویگی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاویگی　　دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آویگی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

یہ کھیپ بھری جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی　　اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی　　کیا برتن سونے چاندی کے کیا مٹی ہنڈیا چینی کی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لئے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل　　اک تنکا ساتھ نہ جاویگا موقوف ہوا جب ان اور جل
گھر بار اٹاری چوپاری کیا خاصہ نین سکھ اور ململ　　کیا چلمن پردے فرش نئے کیا لال پلنگ اور رنگ محل

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

اِس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے!

ہے دنیا جسکا نام میاں وہ اور طرح کی بستی ہے　　جو مہنگوں کو یہ مہنگی ہے اور سستوں کو یہ سستی ہے
یاں ہر دم جھگڑے اٹھتے ہیں ہر آن عدالت بستی ہے　　گر مست کرے تو مستی ہے اور پست کرے تو پستی ہے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کا مان رکھے تو اسکو بھی یاں مان ملے　　جو پان کھلاوے پان ملے جو روٹی دے تو نان ملے
نقصان کرے نقصان ملے احسان کرے احسان ملے　　جو جیسا جسکے ساتھ کرے پھر ویسا اسکو آن ملے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کی جان بخشے تو اُسکا بھی حق جان رکھے   جو اور کسی کی آن رکھے تو اُسکی بھی حق آن رکھے
جو یاں کا رہنے والا ہے یہ دل میں اپنے جان رکھے   یہ چرت پھرت کا نقشہ ہے اس نقشے کو پہچان رکھے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

جو پار اُتارے اوروں کو اُسکی بھی پار اُترنی ہے   جو غرق کرے پھر اُسکو بھی ڈبکوڈبکوں ہی کرنی ہے
شمشیر تبر بندوق سنان اور نشتر تیر نہرنی ہے   یاں جیسی جیسی کرنی ہے پھر ویسی ویسی بھرنی ہے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

جو اوپر اونچا بول کرے تو اُسکا بول بھی بالا ہے   اور دے پٹکے تو اُسکو بھی کوئی اور پٹکنے والا ہے
بے ظلم و جفا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے   اُس ظالم کے بھی لوہو کا پھر بہتا ندی نالا ہے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کو ناحق میں کوئی جھوٹی بات لگاتا ہے   اور کوئی غریب اور بیچارہ حق ناحق میں لٹ جاتا ہے
وہ آپ بھی لوٹا جاتا ہے اور لاٹھی پاٹھی کھاتا ہے   جو جیسا جیسا کرتا ہے پھر ویسا ویسا پاتا ہے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

ہے کھٹکا اُسکے ہاتھ لگا جو اور کسی کو دے کھٹکا   اور غیب سے جھٹکا کھاتا ہے جو اور کسی کو دے جھٹکا

چھریکے بیچ میں چیرا ہے اُد پتلے بیچ جو ہے پٹکا کیا کہئیے اَور نظیرؔ آگے ہے اور تماشہ جھٹ پٹکا
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اَور عدل پرستی ہے
اِس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

ایامِ طفلی

کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دودھ کے چٹورے ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے
پاؤں میں کالے ٹیکے ہاتھوں میں نیلے ڈورے یا چاند سی ہو صورت یا سانورے و گورے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

[illegible] کی طرح سے ہر دم سینے پہ پھولتے تھے پی پی کے دودھ ماں کا خوش ہو کے جھولتے تھے
ماں باپ انکی خدمت سر پر قبولتے تھے ہاتھوں میں کھیلتے تھے جھولوں میں جھولتے تھے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

نے دوستی کسی سے نے دل میں اُنکے کینہ جانیں نہ بے قرینا نے سمجھیں کچھ قرینا
نے گرمیوں سے واقف نے جانتے پسینہ چھاتی سے ماں کی لپٹے خوش اُنکو دودھ پینا
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

جو دیکھے اِن کی صورت وہ پیار سے کھلاوے ہاتھوں میں لے اُچھالے اَور چھیڑ کر ہنسا دے
چومے کبھی دہن کو چھاتی کبھی لگا دے کوئی چوسنی دے مُنہ میں کوئی جھنجھنا بجاوے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

چھوٹا سا کوئی اُنکا کرتا نکالتا ہے یا چھوٹی ٹوپی سر پر سنبھالتا ہے

ماں دودھ ہے پلاتی اور باپ پالتا ہے نانا گلے لگا دے دادا اُچھالتا ہے

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

کیا عمر ہے عزیزو اور کیا یہ وقت ہیگا جب گھٹنیوں پہ آئے پھر اور کچھ تماشا

پاؤں چلے تو واں سے پھر اور پیار ٹھہرا سب زندگی کا حظ ہے انکو نظیر ہا ہا

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب حالی

تعارف

۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ شاعری کے دور حاضرہ کے جسقدر شاعر ہیں۔ سب کے سب اُسی راستے پر قدم زن ہیں۔ جو مولانا حالی نے اختیار کیا تھا۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد آپ ہی پہلے شخص ہیں۔ جنہے زُلفِ یار کے پھندوں سے آزاد ہو کر اور حسن و عشق کے افسانوں کو ترک کر کے شاعری کا نیا باب کھولدیا۔ اور نیچرل اور علمی و ادبی نیز قومی اور اخلاقی نظموں کی طرح ڈالی۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب شاعر لوگ گل و بلبل کی عشقیہ داستانوں سے باہر قدم رکھنا گنا وعظیم خیال کرتے تھے۔ اگر کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ کہ مے و معشوق کے سوائے شاعری ممکن بھی ہے۔ لیکن مولانا حالی نے نہ زمانے کے رُخ کی پرواہ کی نہ مخالفوں کی مخالفت کی۔ اور آج یہ حال ہے۔ کہ اُردو شاعری میں انقلابِ عظیم واقعہ ہو چکا ہے۔ ورنہ اِس کا میدان غزل گوئی تک ہی محدود تھا۔ افسوس کہ ۱۹۱۵ء میں آپ کا انتقال ہو گیا +

دعا

اے کہ تیری ذات ہے عالم پناہ   اسود و احمر کا ہے تو بادشاہ

جوڑنا ٹوٹوں کا ترے ہاتھ ہے — تیری صفت جامع اشتات ہے

مُنتج ادبار ہے جب تک نفاق — مثمرِ اقبال ہے جب تک وفاق

تلخ ہے جب تک ثمرِ اختلاف — ہے تر و تازہ شجرِ ائتلاف

بھیجیو نکبت نہ کسی قوم پر — رکھیو ہر اک قوم کو شیر و شکر

ٹوٹے نہ آفاق میں سنگت کوئی — ہو نہ پراگندہ جماعت کوئی

بند سے ہو بند نہ کوئی جُدا — بکھرے نہ شیرازہ کسی قوم کا

ق
پھوٹ کسی قوم میں پڑ جائے جب — ایک سے ایک اُن میں بچھڑ جائے جب

رکھنی ہے باقی تجھے گر اُن کی نسل — تفرقہ کر اُن کا مُبدّل بہ وصل

ق
ورنہ اگر ہو نہ ملاپ اُن کو راس — اور نہ ہو سر جوڑنے کی اُن کے آس

وہ جئے تو کیا جئے بے آبرو — جلد اُٹھا لے اُنہیں دنیا سے تُو

پھوٹ ہو جس قوم میں وہ قوم کیا
حق میں ہے اُس قوم کے بہتر فنا

صدائے زمانہ

گیا دَورہ حکومت نہ بس اب حکمت کی ہے باری — جہاں میں چار سُو علم و عمل کی ہے عملداری

جنہیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ اُنکو — کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری

ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں — نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری

جہاں علم تجارت میں نہ ماہر ہونگے سوداگر — تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری

نہ آئینگی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت — جنہیں پائینگے آقا زیورِ تعلیم سے عاری
اگر چاہینگے کرنی آدمی گھوڑوں کی سائیسی — تو دینا ہوگا اُن کو امتحانِ علم بیطاری
نہ مستغنی بکاول علم سے ہے اب نہ باورچی — ہُوا ہے مدرسوں سے مطبخوں تک فلسفہ جاری
یقین جانو کہ آیندہ ملے گی درسگاہوں میں — گر آٹا پیسنے کو چاہیے گی اِک پسنہاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز — نہ فصّادی نہ جرّاحی نہ کحّالی نہ عطّاری

جہاں تک دیکھئے تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پُوچھو تو نیچے علم ہے اُوپر خدائی ہے

گئے وہ دِن کہ تھا علم و ہنر انسان کا اِک زیور — ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا — نہ زرگر اَور نہ آہن گر نہ بازی گر نہ سوداگر
مہندس چاہئے مزدور اب اَور راج اقلیدس — بس اب دُنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور
نہ پہنیگا کوئی جاہل کی شاید سی ہوئی جوتی — بس اب جی فلاطوں سے یونہیں کچھ ہوں تو ہوں کمتر
جہانداری میں آج ایک ایک عامل ہے جم و کسریٰ — جہانگیری میں ہے اِک اِک سپاہی طغرل و سنجر
گئے وہ دن کہ تھی محدود کام اِنسانکے سارے — برابر تھا بئے کا گھونسلا اَور آدمی کا گھر
یہ دَورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا — جو آج اِک کام ہے اعلےٰ تو کل ہے اُس سے اعلیٰ تر
کوئی دن میں خسارہ سب سے بڑھ کر اسکو سمجھینگے — کہ دو دن آدمی ٹھہرا رہے یہاں ایک حالت پر
نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ اِنسان و حیواں میں — دیا ہے امتیاز اِنساں کو یہ تعلیم نے آکر

زمانہ نام ہے میرا تو مَیں سب کو دِکھا دُونگا
کہ جو تعلیم سے بھاگینگے نام اُنکا مِٹا دُونگا

جوانمردی

تھا کسی مُلک میں اِک دولت مند حق نے تین اُسکو دیے تھے فرزند
دُور و نزدیک تھا گھر گھر چرچا باپ بیٹوں کی جوانمردی کا
باپ ہوں جن کے مُروّت والے بیٹے پھر کیوں نہ ہوں ہمت والے
ہو چکا عُمر کا جب سرمایہ ایک دِن باپ کے جی میں آیا
گھر ہے تکرار کا یہ دولت و زر مشترک چھوڑ مرے اِس کو اگر
جلد ہو جائے کہیں یہ تقسیم آخر اِک روز ہے مرنا تسلیم
بس کہ تھا اس کو بہت فکرِ مآل ایک دن بیٹھ کے سب مال و منال
اِک گراں مایہ جواہر کے سوا تینوں بیٹوں کو وہیں بانٹ دیا
پھر کہا اُن سے کہ اے اہلِ ہُنر باپ کی جان فدا ہو تُم پر
تم میں جس سے ہو بڑا کام کوئی یہ جواہر ہے امانت اُس کی
باپ نے اُن سے کہا جب یہ سخن پھر تو تینوں کو لگی اور ہی دُھن
کہ کوئی کارِ نمایاں کیجے جس طرح ہو یہ جواہر لیجے
اُن میں بیٹا جو بڑا تھا سب سے اس کو یہ فکر سوا تھا سب سے
ایک دِن اُس کا کوئی واقف کار کہ نہ تھا جس کو کچھ اخلاص و پیار
رکھ گیا آ کے جوانمرد کے پاس ایک بھاری سی رقم بے وسواس
تھے رقم سے وُہی دونوں آگاہ نہ نوشتہ تھا کوئی اور نہ گواہ
کچھ بھی نیت میں گر آجائے خلل تو یہ تھا عین خیانت کا محل

جب رقم اُس نے طلب کی اُس سے — وسوسے دِل میں بہت سے آئے
مگر اُس شیر کی نیت نہ پھری — لی تھی جن ہاتھوں، اُنہیں ہاتھوں دی
نفس سرکش کو کیا مات اُسنے — دی رقم اور نہ دی بات اُسنے
صاحبِ زر نے جو کچھ نذر کیا — وُہ بھی اُس دِل کے غنی نے نہ لیا
باپ کو آن کے دی جب یہ خبر — ہنس کے فرمایا کہ اے جانِ پدر
اِک بُرائی سے بچے تُم تو کیا — اس سے بڑھکر بھی کوئی کام کیا
اِک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز — شرم کی جا ہے۔ تری عُمر دراز

مُجھسے بیٹے نے پھر اِک دن یہ کہا — مَیں جو دریا کی طرف جا نِکلا
دیکھتا کیا ہوں کہ اِک طفلِ صغیر — گر کے پانی میں چلا صُورتِ تیر
تھا جہاں یار نہ کوئی یاور — ماں کا پہلو تھا نہ آغوشِ پدر
آنکھ تھی جانبِ مادر نگراں — ماں کنارے پہ اُدھر تھی حیراں
گرچہ تھا کام خطرناک بڑا — پر اُسے دیکھ کے دل رہ نہ سکا
جان و تن کی نہ رہی مجھ کو خبر — جا پڑا نام خدا کا لے کر
جان تو جا ہی چُکی تھی اُس کی — پر مری شرم خُدا نے رکھ لی
ایک دم بھر میں گیا اور آیا — لا کے بیٹے کو دیا ماں سے مِلا
باپ نے سُن کے یہ سب بس یہ کہا — کام مردوں کے یہی ہیں بیٹا
آدمیت کا کیا تُم نے کام — جاؤ بس ہے یہی اِس کا اِنعام
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے — نہ ہو اِتنا بھی تو اِنساں کیا ہے

پسرِ خُرد کا اب سُنیے بیاں — جو کہ تھا سب سے بزرگی میں کلاں

عرض کرتا ہے بصد عجز و نیاز — باپ سے اپنے کہ اے بندہ نواز

بات گو لائقِ اظہار نہیں — آپ سے کہنے میں کچھ عار نہیں

خوب اِک روز گھٹا چھائی تھی — رات آدھی کے قریب آئی تھی

شبِ تاریک میں وُہ ابرِ سیاہ — کہ جہاں کام نہ کرتی تھی نگاہ

اِک پہاڑی پہ چلا جاتا تھا — خوف چھاتی پہ چڑھا جاتا تھا

ساتھ تم تھے نہ کوئی بھائی تھا — مَیں تھا اور عالمِ تنہائی تھا

کوندی اِک سمت سے بجلی ناگاہ — جس سے آگے کو کھلی راہِ نگاہ

پڑی اِک غار پہ واں میری نظر — جس کی صورت سے برستا تھا خطر

موت کھولے ہوئے تھی مُنہ گویا — جس کے دیکھے سے جگر ہلتا تھا

دیکھتا کیا ہُوں کہ اِک مردِ غریب ۱ جس کو روتے ہیں کھڑے اُس کے نصیب

جیسے رستے کا تھکا ہو کوئی ۲ یا کہ جینے سے خفا ہو کوئی

جانِ تن کا نہیں کچھ بھی ہوش ۳ غار کے مُنہ میں پڑا ہے مدہوش

اپنی ہستی کی نہیں اس کو خبر — اور قضا کھیل رہی ہے سر پر

اجل آ جائے تو ہو رد کت تمام — ایک کروٹ میں ہو بس کام تمام

اِتنے میں اور جو بجلی چمکی — شکل پھر غور سے دیکھی اُس کی

مرد نکلا وُہ شناسا میرا — تھا مگر خون کا پیاسا میرا

مجھ میں اور اُس میں عداوت گہری — ایک مُدت سے چلی آتی تھی

واں عداوت پہ گر آؤں اپنی ق اور اصالت پہ نہ جاؤں اپنی

مارنا اُس کا نہ تھا کچھ دشوار ۔۔۔ اِک اشارہ میں وُہ تھا لقمۂ خار
آگیا مجھ کو مگر خوفِ خدا ۔۔۔ اَور پہلو سے یہ دی دل نے صدا
مرتے کو مارنا بے دردی سے ۔۔۔ ہے بہُت دُور جوانمردی سے
حوصلہ کا ہے یہی وقت کہ آج ۔۔۔ ہے عدو اپنی مدد کا محتاج
جی میں یہ کہہ کے بڑھا جانبِ غار ۔۔۔ کہ اسے کیجئے چل کر بیدار
وہاں سرجا اُس کو تھا پایا پر ۔۔۔ موت کی زد سے بچا لایا میں
مُنہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیے ۔۔۔ اُس کو شرمندۂ احساں نہ کیا
سُن کے دی باپ نے بیٹے کو دعا ۔۔۔ اَور چھاتی سے لیا اُس کو لگا
پھر بڑے بیٹوں کو بلوا کے کہا ۔۔۔ بولو اب کس سے ہوا کام بڑا!
داستاں جب یہ سنی دونوں نے ۔۔۔ باپ سے عرض یہ کی دونوں نے
خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف ۔۔۔ پُوچھئے ہم سے تو ہے یہ انصاف
جس جواہر کے طلبگار تھے ہم ۔۔۔ اُسکے لائق تھے نہ حقدار تھے ہم
اَور کو اُس کی ہوس ناحق ہے ۔۔۔ حق یہی ہے کہ وہ اِس کا حق ہے
باپ یہ سُن کے ہُوا شاد بہُت ۔۔۔ اُن کے انصاف کی دی داد بہُت
چھوٹے بیٹے کو بلا کر پھر پاس ۔۔۔ پہلے خالق کا کیا شکر وسپاس

پھر جواہر اُسے دے کر یہ کہا
لو یہ ہو تم کو مُبارک بیٹا

مٹّی کا دِیا

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹّی کا دیا ایک بُڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا

تا کہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں راہ سے آساں گزر جائے ہر اِک چھوٹا بڑا

یہ دیا بہتر ہے اُن جھاڑوں سے اور اُس لیمپ سے روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا

گر نکل کر اِک ذرا محلوں سے باہر دیکھئے ہے اندھیرا گھُپ در و دیوار پر چھایا ہُوا

سُرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جنکی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

حُبِّ وطن

اے وطن اے مرے بہشتِ بریں کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دُوری ہے موردِ آلام تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے گُل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مِٹ گیا نقشِ کامرانی کا تجھ سے تھا لُطف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دُور سدا اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

ہو گیا یہاں تو دو ہی دن میں یہ حال تجھ بن ایک ایک پل ہے اِک اِک سال

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار　یا کہ دنیا ہے تیری عاشقِ زار
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں؟　اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں؟
جن و انسان کی حیات ہے تو　مُرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کا نمو تجھ سے　رُوکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما　سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
تیری اِک مشتِ خاک کے بدلے　لُوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جُدا
کوئی دُشمن نہو وطن سے جُدا

خطاءِ نفس

نفس دعوئی بیگنہی کا سدا کرتا رہا!　گرچہ اُترے جی سے دِل اکثر دیا کرتا رہا
حق نے احسانات کی اور میں کفران میں کمی　وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا
چوریوں سے دیدہ و دِل کی نہ شرمایا کبھی　چُپکے چُپکے نفسِ خائن کا کہا کرتا رہا
طاعنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہِ خطا　وار اُن کا اِس لئے اکثر خطا کرتا رہا
نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی　اس کو حیلے دِل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا
مُنہ نہ دکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہیں　اُن سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا
تھا نہ استحقاق جن میں پرستی تھیں سدا　حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا
شہرت اپنی جسقدر بڑھتی گئی آفاق میں　کبرِ نفس اُتنا ہی یہاں نشو و نما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تُو نے اُسے حالی! مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

شعر کی طرف خطاب

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تُو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے۔ جو نہ ہو دل گداز تُو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو

حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو
آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو

تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کر کے رہیگا جہاز تو

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری
قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو

اہلِ نظر کی آنکھ میں رہتا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو

ناک اور پری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
معذور جان اُن کو جو ہے چارہ ساز تو

چُپ چاپ اپنے پیچ سے تو جا دِلوں میں گھر
اُونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تو

جو نابلد ہیں اُن کو بتا خضر بن کے راہ
گر چاہتا ہے خضر کی عمر دراز تو

عزّت کا ہے سید ملک کی خدمت میں چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرنی ہے فتح گر نئی دُنیا تو لے نکل
بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر۔ پہ بے قدریوں کیساتھ
اسکے خلاف ہو تو سمجھ اسکو شاذ تو

جو قدر داں ہو اپنا اُسے مغتنم سمجھ
حالیؔ کو تجھ پہ ناز ہے گر اُس پہ ناز تو

---

۱ خودستائی

اے دل بشر وہ کون ہے جو خودستا نہیں — پر۔ خودستائیوں کے ہیں عنواں جُدا جُدا
جو زیورِ خرد سے معرا ہیں سادہ لوح — کرتے ہیں خُوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو ان سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وُہ — پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا
کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج — کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دیدیا
کہتا ہے دُوسرا کہ گیا ہو کے منفعل — سائل کی ڈب میں مَیں نے دیا مال جب دکھا
پردہ میں زیرکی کے چھپاتا ہے بخل یہ — اور بن کے بیوقوف جتاتا ہے وُہ سخا
کچھ اسلئے کہ ہم بھی انہیں میں سے ہوں شمار — اہلِ وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ۔ اِسلئے کہ اپنا ہو اِنصاف آشکار — کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جابجا
کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے بُرا کوئی — ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا
کہتا ہے ایک گر ہے خوشامد کا اور ہی — پر چاہتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم بُرا
دھوکا ہُنر کا دیکے چھپاتا ہے عیب یہ — اور مُنہ سے درد کہکے دکھاتا ہے وُہ صفا
چُپ چاپ سُن رہا ہے کوئی اپنی خُوبیاں — یعنے کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا
کہتا ہے اُس پہ کوئی کہ سب حسنِ ظن ہے یہ — اِک خاکسار کو جو دیا تُم نے یُوں بڑھا
قانع ہے وُہ انہیں پہ۔ ہوئے وصف جو بیاں — اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا

کہتا ہے زید۔ عمرو ہے شدت سے سادہ لوح — گنتا ہے سب کو نیک وہ۔ اچھا ہو یا بُرا
کہتا ہے عمرو۔ زید بھی گنتا ہے عیب ہیں — بد ہو کہ نیک۔ اُسکی زباں سے نہیں بچا
یہ اُسکا اور وہ اِسکا بیاں کرکے کوئی عیب — ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا
غیبت۔ اُمید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں — ہوتا اگر یہ خاک کا پُتلا نہ خودستا
حالی جو پتری کھول رہے ہیں جہان کی — شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ مُدعا
یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب — اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا

القصہ جسکو دیکھیے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بیچارہ مُبتلا!

دلی کا مرثیہ

جیتے جی موت کے تم مُنہ میں نہ جانا ہرگز — دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی — دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
زال کی پہلی ہی رُستم کو نصیحت یہ تھی — زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز
وجاہت اِک طلعتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں — کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے — تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز
جتنے رستے تھے ترے ہو گئے ویران اے عشق — آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدرشناس — قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لیکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانیکے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جسکو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئینگے کیا انپہ جہان روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھکو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دور زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

داغ د مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنیگا کوئی بُلبُل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لُطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں - بزمِ سخن ہے حالی
یاں مُناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

ہماری حالت

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

یاد اسکی دل سے دھو دے ای چشمِ تر تو مانوں
اب دیکھنی تجھے بھی تیری روانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
اُلفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

غیبت ہو یا حضوری دونو بری ہیں تیری
جب بدگمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں

کہتے ہیں جسکو جنت وہ اِک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

رحمت تری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے
شافیں ہیں تیری جتنی دبانِ جہانیاں ہیں

ہو گا تو پہلے ہو گا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں ہیں خوش
حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جنکے نشان تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی انکی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی تک قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آتی آگے گرانیاں ہیں

کھیتونکو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا

تعارف

۱۸۷۵ء میں پنجاب کے مشہور شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں تعلیم پائی۔ اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ساتھ ہی شاعری کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب پنجاب میں اُردو شاعری کا زور تھا۔ اور پڑھے لکھے نوجوان شاعر نہ ہونا گناہِ عظیم سمجھتے تھے۔ لیکن پروفیسر اقبال قدرت سے اِس قِسم کا دِل و دماغ لیکر آئے تھے۔ کہ چند دِنوں میں ہی دُھوم مچ گئی۔ اور ہندوستان بھر کے اُردو شاعروں کو معلوم ہو گیا۔ کہ خطۂ پنجاب میں ایک سِتارے کا ظہور ہؤا ہے۔ جو چند دِنوں میں آفتاب بن کر چمکیگا۔ اُس وقت اُن کی سب سے پہلی نظم جس نے اُن کا درجہ شاعری کی صف میں بلند کیا۔ "ہندوستان ہمارا" تھی۔ غیر ممکن تھا کہ اِس قِسم کا دماغ اپنا وقت لڑکے پڑھانے میں ضایع کر دیتا۔ پروفیسر صاحب ولایت گئے۔ اور بیرسٹر بن آئے۔ لیکن اپنے ہم پیشہ بھائیوں کی مانند روپیہ کمانا مقصودِ حیات نہیں بنایا۔ بہت کم مُقدمے لیتے ہیں۔ اور جو لیتے ہیں وہ صرف اِتنے کہ فارغ البالی سے گذران ہو سکے۔ اِسوقت حالت یہ ہے کہ مُلک ڈاکٹر اقبال کو دورِ حاضرہ کا اُستاد تسلیم کرتا ہے۔ اور جب کبھی آپکی نظم شائع ہوتی ہے۔ تو مہینوں اخبارات نقل کرتے رہتے ہیں۔ آپ کا کلام بہت مُشکل ہوتا ہے۔

موجِ دریا

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بیتاب مجھے ۔ عین ہستی ہے تڑپ صورتِ سیماب مجھے
موج ہے نام مرا بحر ہے پایاب مجھے ۔ ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے

آب میں مثل ہوا جاتا ہے توسن میرا
خارِ ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہ کامل سے ۔ جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے ۔ کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے

زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت سے پریشاں ہوں میں

غنچۂ آب میں گلشن کی تماشائی ہوں ۔ اپنی ہستی کو مٹانے کی تمنائی ہوں
کشتۂ عشق ہوں محرومِ شکیبائی ہوں ۔ حوصلہ دیکھ کہ میں بحر کی سودائی ہوں

زندگی جزو کی ہے کل میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا ۔ جہان میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا ۔ شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اسکی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جسکی

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سنی

سحر نے تارے سے سنکر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمین کے محرم کو

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہوگیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

مرثیہ سسلی

رولے اب دل کھول کر تو اے دلِ خونابہ بار
یہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

یہ محل خیمہ تھا ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
شعلۂ جانسوز پنہاں جن کی تلواروں میں تھے

آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل
جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل

زندگی دنیا کو جن کی شورشِ قم سے ملی
مخلصی انساں کو زنجیرِ توہم سے ملی

جس کے آوازے سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس بھی اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے
آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس صحرا کے پانی میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحرِ پیما کو رہے
ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام
تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا
نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسمان نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
مرثیہ تیری تباہی کا میری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا میری قسمت میں تھا
ہے تیرے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں

جسکی تو منزل تھا میں اُس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصۂ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لیجاؤنگا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤنگا

کنجِ عزلت

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب
کیا لُطف انجمن کا جب دِل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے ہوں گریزاں دِل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فِدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامانِ کوہ میں اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

لذت سرُود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

گُل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

صف باندھے دونوں جانب بُوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دِلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بنکر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

مہندی لگائے سُورج جب شام کی دُلہن کو
سُرخی لئے سُنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کے چلنے والے رہ جائیں تھک کے جسدم
اُمید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دِیا ہو

پچھلے پہر کی کوئل وُہ صبح کی موذن
میں اُس کا ہمنوا ہوں وُہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں — روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے — رونا مرا وضو ہو نالہ مرا دعا ہو
دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو — سرسبز جن کی نم سے بوٹا امید کا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے — تاروں کے قافلے کو میری صدا دوا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں — فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں — ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم — قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم — نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے بھی تری ذات قدیم — پھول تھا زیب چمن، پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحب الطاف عمیم — بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں معبود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی اِنسان کی نظر مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خُدا کو کیونکر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوت بازوئے مُسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی اہلِ چین چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی اِسی دُنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں خُشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لئے سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے
قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میدان سے اُکھڑ جاتے تھے

تجھ سے سرکش ہُوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے   تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سُنایا ہم نے

تُو ہی کہہ دے کہ اُکھاڑا درِ خیبر کس نے؟   شہر قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوقِ خداوندوں کے پیکر کس نے؟   کاٹ کر رکھ دئے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کونسی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی؟   اور تیرے لئے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی؟   کس کی تکبیر سے دُنیا تری بیدار ہوئی؟
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہُوئے رہتے تھے؟
مُنہ کے بل گر کے ہُوَ اللہُ اَحد کہتے تھے؟

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز   قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز   نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے   مے توحید کو لیکر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے   اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دَوڑا دئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے　　نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے　　تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں! تُو بھی تو دلدار نہیں

اُمتیں اور بھی ہیں اُن میں گنہگار بھی ہیں　　عجز والے بھی ہیں مست مئے پندار بھی ہیں
اُن میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں　　سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مُسلمانوں پر

بُت صنم خانے میں کہتے ہیں مُسلمان گئے　　ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے　　اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں۔ ہیں ان کے خزانے معمور　　نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حُور و قصُور　　اور بیچارے مُسلماں کو فقط وعدۂ حُور

اب وُہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں!
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

کیوں مُسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب　　تیری قُدرت تو ہے وُہ جسکی نہ حد ہے نہ حساب
تُو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حُباب　　رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعن اغیار ہے رسوائی و ناداری ہے!

کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا!   رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا   پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے   شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے

دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے   آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لیکر

اب اُنہیں ڈھونڈو چراغِ رُخِ زیبا لیکر

دردِ لیلیٰ بھی وُہی قیس کا پہلو بھی وُہی   نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی

عشق کا دل بھی وُہی حسن کا جادو بھی وُہی   اُمتِ احمدِ مرسل بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیِ غیر سبب کیا معنی؟

اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا؟   بُت گری پیشہ کیا بُت شکنی کو چھوڑا؟

عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟   رسمِ سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں!

زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں!

عشق کی خیر وُہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی   جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی

مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی   اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی!

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے　　اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے　　پھونک دی گرمیٔ رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں؟
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں؟

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا　　قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا　　گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی وبصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے　　سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے　　تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہو بیٹھے

پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے
برق دیرینہ کو فرمان جگرسوزی دے

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز　　لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز　　تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے
طور مضطر ہے اسی آگ سے جلنے کیلئے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے　　مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے

جنسِ نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے — یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرت دیرینۂ ما

می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن — کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن — اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بُلبُل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک

اِسکے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں — پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں — ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عُریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی

کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اِس کی

لُطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں — کچھ مزا ہے تو یہی خُونِ جگر پینے میں

کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں — کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اِس گلِستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں

داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وُہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دِل ہوں — جاگنے والے اِسی بانگِ درا سے دِل ہوں

یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں — پھر اُسی بادہ دیرینہ کے پیاسے دِل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

جوابِ شکوہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں۔ طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اُٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے

اُڑ کے آواز مری تا بفلک جا پہنچی!
یعنی اُس گل کی مہک عرش تلک جا پہنچی!

جب مے دردسے ہو خلقتِ شاعر مدہوش
آنکھ جب خون کے اشکوں سے بنے لالہ فروش
کشورِ دل میں ہوں خاموش خیالوں کی خروش
چرخ سے سوئے زمیں شعر کو لاتا ہے سروش

قیدِ دستور سے بالا ہے مگر دل میرا!
فرش سے شعر ہوا عرش پہ نازل میرا!

پیرِ گردوں نے کہا سُن کے "کہیں ہے کوئی"
بولے سیارے "سرِ عرشِ بریں ہے کوئی"
چاند کہتا تھا "نہیں! اہلِ زمیں ہے کوئی"
کہکشاں کہتی تھی "پوشیدہ یہیں ہے کوئی"

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا!
عرش والوں پہ بھی کُھلتا نہیں یہ راز ہے کیا!
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا؟
آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟

غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں؟
شوخ گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں؟

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے

عالم کیف ہے دانائے رموز کم ہے ہاں! مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

آئی آواز! غم انگیز ہے افسانہ ترا مۓ فریاد سے معمور ہے پیمانہ ترا
ہے ہم آغوش فلک نعرۂ مستانہ ترا کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تُو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تُو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئے دیتے ہیں
ڈھونڈھنے والونکو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں

جس طرح احمدِ مختار ہے نبیوں کا امام اُس کی اُمت بھی ہے دُنیا میں امامِ اقوام
کیا تمہارا بھی نبیؐ ہے وُہی آقائے انام تم مسلماں ہو؟ تمہارا بھی وُہی ہے اسلام
اُسکی اُمت کی علامت تو کوئی تم میں نہیں
مے جو اسلام کی ہوتی ہے وہ اِس خم میں نہیں

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں اُمتی باعثِ رسوائیٔ پیغمبر ہیں
بُت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں تھا براہیم پدر اَور پسر آذر ہیں
کہیں تہذیب کی پُوجا کہیں تعلیم کی ہے
قوم دُنیا میں یہی احمدِ بے میم کی ہے

کشورِ ہند میں کلیسۂ ناکام کا بُت عربستاں میں شفا خانۂ اسلام کا بُت
اور لندن میں عبادتکدۂ عام کا بُت لیگ والوں نے تراشا ہی بڑے نام کا بُت

بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے
یعنی کعبہ بھی نیا بُت بھی نئے تم بھی نئے

وُہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا

کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کرلو
ملتِ احمدِ مرسل کو مقامی کرلو

کِس قدر تُم پہ گراں صُبح کی بیداری ہے ہم سے کب پیار ہے! ہاں! نیند تمہیں پیاری ہے
طبع آزاد ہے قیدِ رمضان بھاری ہے تُمہیں کہدو! یہی آئینِ وفاداری ہے

قوم مذہب سے ہے۔ مذہب جو نہیں۔ تم بھی نہیں
جذبہ باہم جو نہیں۔ محفلِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دُنیا میں کوئی فن تُم ہو! نہیں جِس قوم کو پروائے نشیمن۔ تم ہو!
بجلیاں جسمیں ہوں آسودہ وُہ خرمن تم ہو! بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو!

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کرکے
کیا نہ بیچوگے جو مِل جائیں صنم پتھر کے

صفحۂ دہر سے باطل کو مِٹایا کِس نے؟ نوعِ اِنساں کو غلامی سے چھڑایا کِس نے!
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کِس نے؟ میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کِس نے؟

تھے تو آبا وُہ تُمہارے ہی۔ مگر تُم کیا ہو؟

ہاتھ پر ہاتھ رکھے منتظرِ فردا ہو؟

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور — شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور — مسلم آئیں ہوا کافر۔ تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے۔ موسیٰؑ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبی۔ دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی۔ اللہ بھی۔ قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی؟ ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟ — مصلحت وقت کی ہے کس کی عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟ — ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں۔ روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب — زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب — پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب

اُمرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملّتِ بیضا غُربا کے دم سے

واعظِ قوم کی وُہ پختہ خیالی۔ نہ رہی! — برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی۔ نہ رہی!
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی۔ نہ رہی! — فلسفہ رہ گیا۔ تلقینِ غزالی۔ نہ رہی!

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ "نمازی نہ رہے

یعنی۔ وُہ صاحب اوصافِ حجازی نہ رہے

شور ہے "ہو گئے دُنیا سے مُسلماں نابود" ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مُسلم موجود

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود یہ مُسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یُوں تو سیّد بھی ہو۔ مرزا بھی ہو۔ افغان بھی ہو

تم سبھی کچھ ہو۔ بتاؤ تو مُسلمان بھی ہو؟

دمِ تقریر تھی مُسلم کی صداقت بیباک عدل اُسکا تھا قوی لوثِ مراعات سے پاک

شجرِ فطرتِ مُسلم تھا حیا سے نمناک تھا شجاعت میں وُہ اِک ہستیِ فوق الادراک

خود گدازی نمِ کیفیتِ صہبائش بود

خالی از خویش شدن صورتِ مینائش بود

ہر مُسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا اُس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا

جو بھروسہ تھا اُسے قوّتِ بازو پر تھا ہے تمہیں موت کا ڈر۔ اُسکو خُدا کا ڈر تھا

باپ کا عِلم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو؟

پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو؟

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے تم مُسلمان ہو! یہ اندازِ مُسلمانی ہے

حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وُہ زمانے میں مُعزز تھے مُسلماں ہوکر

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

تُم ہو آپس میں غضبناک وُہ آپس میں رحیم تم خطاکار و خطابیں۔ وُہ خطاپوش و کریم

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی اُن کا تھا سریرِ کَے بھی
یوں ہی باتیں ہیں ۔ کہ تم میں وُہ حمیّت ہے بھی

خودکشی شیوہ تُمہارا ۔ وُہ غیور و خوددار تُم اخوت سے گریزاں ۔ وُہ اخوت پہ نثار
تُم ہو گفتار سراپا ۔ وُہ سراپا کردار تُم ترستے ہو کلی کو ۔ وُہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

علمِ حاضر بھی پڑھا زائرِ لندن بھی ہوئے مثلِ انجم اُفقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں ۔ دین سے بدظن بھی ہوئے صفتِ طائرِ گم کردہ نشیمن بھی ہوئے
حال اُن کا ۔ تہذیبِ نو اور زبوں کرتی ہے
شبِ مہ سائے کی ظُلمت کو فزوں کرتی ہے

قیس زحمت کشِ تنہائیٔ صحرا نہ رہے شہر کی کھائی ہَوا بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے ۔ بستی میں رہے یا نہ رہے یہ ضروری ہے حجابِ رُخِ لیلا نہ رہے
شوق تحریرِ مضامیں میں کُھلی جاتی ہے
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے

عہدِ نو برق ہے ۔ آتش زدہ ہر خرمن ہے ایمن اِس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اِس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے ملّتِ ختمِ رُسل شعلہ بہ پیراہن ہے
— آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشان مالی! کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی!
یعنی ہونے کو ہے کانٹوں سے بیاباں خالی! گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی!

ساحلِ بحر یہ رنگِ فلک عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی اُفق تابی ہے

اُمتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں اور محروم ثمر بھی ہیں خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں کاہیدہ بھی بالیدہ بھی ہیں سینکڑوں بطن چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں

نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

تو نہ مِٹ جائیگا ایران کے مِٹ جانے سے نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے!
عصرِ نو رات ہے۔ دھندلا سا ستارا تو ہے!

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکیگا نفسِ اعدا سے

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

ختم کا ہے کو ہُوا کام ابھی باقی ہے

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

ہو نہ افسردہ اگر بِل گئی تعمیر تری ۔۔۔ رازِ توحید! حکومت نہیں تفسیر تری
تُو وُہ سرباز ہے اسلام ہے شمشیر تری ۔۔۔ نظمِ ہستی میں ہے کچھ اَور ہی تقدیر تری

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا؟ لوح و قلم تیرے ہیں

ہو نہ یہ پھُول تو بُلبُل کا ترنم بھی نہ ہو ۔۔۔ چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو ۔۔۔ بزمِ توحید بھی دُنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اِسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اِسی نام سے ہے

وسعتِ کون و مکاں مضراب ہے یہ ۔۔۔ دہر مسجد ہے سراپا۔ خمِ محراب ہے یہ
جام گردوں میں عیاں مثلِ مئے ناب ہے یہ ۔۔۔ روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے یہ

صَوت ہے نغمۂ کُن میں تو اِسی نام سے ہے
زندگی زندہ اِسی نُور کے اتمام سے ہے

دشت میں دامنِ کوہسار میں میدان میں ہے ۔۔۔ بحر میں مَوج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین میں شہرِ مراقش کے بیابان میں ہے ۔۔۔ اَور پوشیدہ مُسلمان کے اِیمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ دیکھے

مردمِ چشمِ زمین یعنی وُہ کالی دُنیا ۔۔۔ وُہ تمہارے شہدا پالنے والی دُنیا
گرمیٔ مہر کی پروردہ ہلالی دُنیا ۔۔۔ عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دُنیا

تپش اندوز ہے اِسی نام سے پارے کیطرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کیطرح

انجم اِسکے۔ فلک اِسکے ہیں۔ زمیں اِسکی ہے
کیا یہ اغیار کی دُنیا ہے؟ نہیں! اِسکی ہے!
سجدے مسجود ہوں جسکے وُہ جبیں اِسکی ہے
وُہ ہمارا ہے امیں۔ قوم امیں اِسکی ہے!

طوف احمدؐ کے امینوں کا فلک کرتے ہیں
یہ وُہ بندے ہیں ادب جنکا ملک کرتے ہیں

مثلِ بُو قید ہے غنچے میں! پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
شوقِ وسعت ہے۔ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

بول اِسی نام کا ہر قوم میں بالا کر دے
اَور دُنیا کے اندھیرے میں اُجالا کر دے

جُگنو

جُگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھُولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غُربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرّہ ہے یا نمایاں سُورج کے پیرہن میں
حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اِک جھلک تھی
لے آئی جسکو قدرت خلوت کی انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظُلمت بھی روشنی بھی
نِکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں
پروانہ اِک پتنگا جُگنو بھی اِک پتنگا
وُہ روشنی کا جویا یہ روشنی سراپا

لسانُ العصر سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی

تعارف

۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپکے کلام میں ایک خاص خوبی جو اور کسی اُردو شاعر میں نہیں پائی جاتی۔ یہ ہے۔ کہ آپ کی ہر ایک نظم میں اچھوتا پن ہے۔ اور ہر ایک مصرعہ مُلکی اور قومی درد کے رنگ میں ڈُوبا ہُوا ہے۔ آج کل آپ بہت کم لکھتے ہیں۔ عُمر زیادہ ہے۔ بینائی کم ہوگئی ہے۔ تاہم جب کبھی دو چار شعر بھی کہتے ہیں۔ تو مُلک میں شور سا مچ جاتا ہے۔

نمازِ چمن

بہار آئی کھلے گُل زیبِ صحنِ بوستاں ہوکر
عنادل نے مچائی دُھوم سرگرم فغاں ہوکر

بچھا فرشِ زمرد اہتمام سبزۂ تر میں
چلی مستانہ وش بادِ صبا عنبر فشاں ہوکر

عروجِ نشۂ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں
ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہوکر

بلائیں شاخِ گُل کی لیں نسیمِ صُبح گاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگینِ بتاں ہوکر

جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا
کسی نے یاسمن ہوکر کسی نے ارغواں ہوکر

کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں
صدائے نغمۂ بُلبُل اُٹھی بانگِ اذاں ہوکر

ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتّی زباں ہوکر

زبانِ برگِ گُل نے کی دُعا رنگیں عبارت میں
خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہوکر

روانیِ دریا

وہ سودے سخن گوئے شیریں مقال ۔ جو انگریزی شاعر تھا اِک باکمال
لکھی اُس نے ہے نظم اِک لاجواب ۔ دِکھائی ہے شکلِ روانیِ آب
جو بہتا ہے پانی میانِ لڈور ۔ اسی کا دِکھایا ہے شاعر نے زور
مناسب جو انگلش مصادر ملے ۔ مقفّٰے کئے ان کے سب سلسلے
یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن ۔ کہ مَیں بھی ہُوں اِس بحر میں غوطہ زن
دِکھاؤں روانیِ دریائے فِکر ۔ کہ گوہر شناسوں میں ہو جسکا ذکر
عجب ہے نہیں ان کی اس پر نظر ۔ کجا میں کجا سودیِ نامور
سِوا اِس کے ہیں اَور بھی مُشکلیں ۔ نہیں سہل اِس راہ کی منزلیں
مرے پاس سرمایہ کافی نہیں ۔ وُہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں
زباں میں نہ وسعت نہ وَیسا مذاق ۔ اِدھر تو ہے کچھ اَور ہی طمطراق
اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط ۔ معانی میں پیدا نہ ہو ربط و ضبط

موانع یہ ہیں جن سے ڈرتا ہُوں میں
مگر خیر کچھ فکر کرتا ہُوں میں

جو تھیں دقتیں کہہ چکا برملا ۔ غرض دیکھئے اب یہ پانی چلا

اُچھلتا ہُوا اور اُبلتا ہُوا　　اکڑتا ہُوا اور مچلتا ہُوا
روانی میں اِک شور کرتا ہُوا　　رُکاوٹ میں اِک زور کرتا ہُوا
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہُوا　　چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہُوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہُوا　　یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہُوا
جھٹکتا ہُوا غُل مچاتا ہُوا　　وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہُوا
وہ گاتا ہُوا اور بجاتا ہُوا　　یہ لہروں کو باہم نچاتا ہُوا
اِدھر جھومتا اور مٹکتا ہُوا　　اُدھر گھومتا اور اٹکتا ہُوا
بپھرتا ہُوا جوش کھاتا ہُوا　　بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہُوا
وہ اُونچے سُروں میں تموّج کا راگ　　وہ خود جوش میں آکے لاتا یہ جھاگ
سُدھرتا ہُوا اور سنورتا ہُوا　　تھرکتا ہُوا رقص کرتا ہُوا"
لپٹتا ہُوا اور چمٹتا ہُوا　　یہ چھٹتا ہُوا وہ سمٹتا ہُوا
یہ گھٹتا ہُوا اور وہ بڑھتا ہُوا　　اُترتا ہُوا اور چڑھتا ہُوا
یہ ہٹتا ہُوا اور وہ بچتا ہُوا　　دباتا ہُوا اور پچتا ہُوا
وہ روئے زمیں کو چھپاتا ہُوا　　وہ خاکی کو بیہیں بساتا ہُوا
گل و خار یکساں سمجھتا ہُوا　　ہر اِک سے برابر اُلجھتا ہُوا
بہاتا ہُوا اور بہتا ہُوا　　ہوا کے طمانچوں کو سہتا ہُوا
بلندی سے گرتا گراتا ہُوا　　نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہُوا
اُچکتا ہُوا اور آتا ہُوا　　اُلٹتا ہُوا اور مڑتا ہُوا
وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہُوا　　زمینوں کو شاداب کرتا ہُوا

یہ مٹکوں کی گودوں کو بھرتا ہوا | وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا
یہ پھولوں کے گجرے بہاتا ہوا | وہ چکر میں بجرے پھنساتا ہوا
لپکتا ہوا دندناتا ہوا | اُمنڈتا ہوا سنسناتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا | سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا | حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا
تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا | شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا
یونہی الغرض ہے یہ پانی رواں | بس اب دیکھ لیں شاعرِ نکتہ داں

وہ سوتی کا سیلاب آب لڑور
یہ بحرِ خیالات اکبر کا زور

تیتریاں

وہ تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں | اک آن میں سو طرف کو پھرتی دیکھیں
بھولی خوش رنگ چست نازک پیاری | پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری
پھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا ابھار | تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار
جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم | وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قائم
گو تابع جوشِ برق پردازی ہیں | دونوں کے خطوط لیک متوازی ہیں
کیونکر میں کہوں کہ یہ نظربندی ہے | اللہ اللہ کیا ہنرمندی ہے
کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں | پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں

اِس سمت اگر خیالِ اِنساں بڑھ جائے
دامانِ نظر پہ رنگِ عرفاں چڑھ جائے

مُتفرقات

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا — شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ — کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا — ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن — ہے وصفِ بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

کہتے ہیں شاعری یہ تری بے اصول ہے — کہتا ہوں صاف میں تو نہیں تجھ کو مانتا
میں نے کہا کہ آپ کی کرتا جو پیروی — تو آپ کے سوا کوئی مجھ کو نہ جانتا

شائقِ تحقیق کے یہ مضمون سن لیں — اِنسان کی شکل جیسے میمون بنا
پاجامہ بھی یونہیں ارتقا سے بدلا — سمٹا اُبھرا غرضکہ پتلون بنا

مغرب کی لُعبتوں نے اسٹیج کو سنوارا — بجنے لگا پیانو چُپ ہو گیا چکارا
بیتاب ہو کے آخر یہ شیخ نے پکارا — دل میبرو ز دستم صاحبدلاں خدارا

دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

گم ہیں مری نظر سے وہ ساحلِ دل آویز ناکامیوں کی موجیں بہنے لگیں بہت تیز
اسٹیمر اپنی ہم کو دیتے نہیں یہ انگریز کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز

باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را

مشرق کے حق میں مہلک مغرب سے ہے یہ پیوند بدنامیوں سے بچ تو اے مصلحِ ہنرمند
مصلح یہ بولا اکبر کی سعی میں لے ہر چند درکوئے نیکنامی مارا گذر نہ دادند

گر تو نمی پسندی تغییر کُن قضا را

خوش چشم آہوؤں کی صحرا میں یہ اُچھل کُود موسم بھی رُوح پرور ساقی بھی حسبِ مقصود
فطرت کیا حکم نافذ تقویٰ کی فکر بے سُود حافظ بخود نپوشید این خرقۂ مے آلود

اے شیخ پاکدامن معذور دار مارا

فہمیدنِ معانی ہر طبع کے تواند لذت بیاید آں دل کو راز ہا بداند
موجے بسینہ خیزد در شوق غرق ماند گر مطربِ حریفاں ایں نظمِ من بخواند

در وجد و حالت آرد پیرانِ پارسا را

خُدا کا گھر نہ رکھا دِل کو بنگلوں میں مکیں ہو کر
بھُلایا عرش کو اس قوم نے کُرسی نشیں ہو کر

بے پاس کے تو ساس کی بھی اب نہیں ہے آس
موقوف شادیاں بھی ہیں اب اِمتحان پر

کرلیا بی بی نے اُنکی انٹرنس اس سال پاس
والد صاحب تو ہیں خاموش لیکن خوش ہیں ساس

انجمن کو یہہ آگ ہو مبارک — انگریز کو بھاگ ہو مبارک
دہلی کو سہاگ ہو مبارک — قومی ہیں راگ ہو مبارک

مرے شکووں سے کیوں بھرتے ہیں وہ اخبار کے کالم — کوئی یہ شیخ سے کہدے کہ سُنئے قبلۂ عالم
جدھر صاحب اُدھر دولت جدھر دولت اُدھر چندہ — جدھر چندہ اُدھر آنر جدھر آنر اُدھر بندہ

رہ گیا دل ہی میں شوق سایۂ الطاف خاص — مجھ کو آنے کی اجازت دی نہیں بڈروم میں
کھانیکے کمرے سے رخصت کردیا بعد از ڈنر — تھیں فقط چھُریاں ہی اُدھر کانٹے مرے مقسوم میں

اُبھرے ہیں عیب اُنکے اور خوبیاں دبی ہیں — بیدین اگر نہیں ہیں تو شیخ جی غبی ہیں
اپنوں کو بد بنایا بندر کو جد بنایا — بُت کو صمد بنایا کیا خوب قرطبی ہیں
اپنی ہوس کے آگے ملت کو چھوڑ بھاگے — اور کہہ دیا کہ ہم تو اِس عہد کے نبی ہیں

حرم میں مسلموں کے رات انگلش لیڈیاں آئیں — پے تکریم مہمان بن سنور کے بیبیاں آئیں
طریق مغربی سے ٹیبل آیا کرسیاں آئیں — دِلوں میں ولولے اُٹھے ہوس میں گرمیاں آئیں
اُمنگیں طبع میں ہیں شوق آزادی کا بلوا ہے — کھلینگے گل تو دیکھو گے ابھی کلیوں کا جلوا ہے

کسی میں دم ہی نہیں ہے تو دم بھریں کس کا　　بزرگ ہی نہیں باقی ادب کریں کس کا

دین و تقویٰ سے بہت دور ہُوا جاتا ہوں　　بادۂ عیش سے مخمور ہوا جاتا ہوں
مری گردن پہ ہیں شیطان کے احسان بہت　　ترک لا حول پہ مجبور ہُوا جاتا ہوں

بہت روئے وہ اپنی سپیچوں میں حکمت اسکو کہتے ہیں
میں سمجھا خیر خواہ اُن کو حماقت اِسکو کہتے ہیں

نئے شیخوں کو کفر سے پاکے قریں - یہی کہتی تھی گوہر زہرہ جبیں
یہ موئے تو صریح ہیں دشمن دین - اے اِنکا تو کوئی خدا ہی نہیں
نئی سڑکوں پہ چلکے تھکینگے بہت - بڑے لوگوں کے منہ کو تکینگے بہت
یہ کمیٹیوں میں تو بکینگے بہت - دلِ سجدے میں شوق دعا ہی نہیں

تنہائی و طاعت کا یہ دور ہے اب دشمن　　پیڑ داں یہ نہ وہ طائر صحرا یہ نہ وہ جوبن
جنگل کے جو تھے سائیں وہ ریل کے ہیں پائیں　　الی کی جگہ سگنل قمری کی جگہ انجن
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے　　کونسل میں بہت سیّد مسجد میں فقط جمّن

پڑے گنگناتے تھے لالہ نرنجن　　نہ آنکھوں میں انجن نہ دانتوں میں منجن
چھٹے ہم سے بالکل وہ اگلے طریقے　　کہاں کھینچ لیجائیگا ہم کو انجن

جب کہا میں نے خدا سے آپ ڈرتے کیوں نہیں
وہ بگڑ کر بول اُٹھے آپ مرتے کیوں نہیں
جب یہ حالت ہے طبائع کی تو کیوں کہتے ہیں لوگ
اکبر اُٹھتے کیوں نہیں واعظ اُبھرتے کیوں نہیں

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور
کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
تہِ دل سے ہم کوستے ہیں مگر
کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

بے نمازوں میں ہیں وہ اور اِسپہ شرماتے نہیں
یہ غنیمت ہے کوئی ٹوکے تو گرماتے نہیں

اُنزا اگر ملے جو ہے نام و نمود میں
کیا حرج زندگی ہو اگر حالِ زشت میں
دوزخ کے داخلہ میں نہیں اُنکو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگا دے جو اُنکا بہشت میں

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اِس زمانے میں
انوکھے ہیں مشاغل حضرتِ اکبر کے اِن روزوں
الم ترکیف ۔ بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیلخانے میں
مرید اُنکے تو شہروں میں اُڑے پھرتے ہیں موٹر پر
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں

مَیں یہ کہتا ہُوں مجھے اچھا کرو احسان ہو
وُہ یہ کہتے ہیں کہ مرجاؤ تو کیا نقصان ہو
مَیں یہ کہتا ہوں مجھے بندہ بنالو اپنا تم
وُہ یہ کہتے ہیں یہ اُس سے کہئے جو شیطان ہو

لڑیں کیوں ہندوؤں سے ہم یہیں کے اُن سے پنپے ہیں
ہماری بھی دُعا یہ ہے کہ گنگا جی کی بڑھتی ہو
مگر ہاں شیخ جی کی پالسی سے ہم نہیں واقف
اسی پر ختم کرتے ہیں کہ جو صاحب کی مرضی ہو

ذرّہ ذرّہ سے لگاوٹ کی ضرورت ہے یہاں
عافیت چاہے تو اِنسان زمیندار نہ ہو
شیخ صاحب یہ مئے سُرخ مجھے تو ہے مفید
شغل کچھ آپ بھی فرمائیں جو انکار نہ ہو
مے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بیزار نہ ہو
پھیر سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وُہ پازیب کی جھنکار نہ ہو
توپ کی طرح چل اس عہد میں گو منہ ہو سیاہ
سرخروئی اب اسی میں ہے کہ تلوار نہ ہو
آپ کی جنبشِ ابرو سے ہوئے شیخ بھی چُپ
سچ تو یہ ہے نہ چلے کام جو تلوار نہ ہو
ابر فکر آپ کا برسا تو بہت اے اکبر
اعتراضات کی احباب میں بوچھار نہ ہو
کہدو اکبر سے یہی لوگ ہیں اسوقت کے شیخ
آل سیّد کو بُرا کہہ کے گنہگار نہ ہو
دل ہے پیغام رساں جاتے ہیں خالق کیطرف
ہم کو کیا غم ہے اگر ریل نہ ہو تار نہ ہو
گو تبرک ہے یہ اے شیخ دلیکن ہے ثقیل
دیکھئے شب کی عبادت کہیں دشوار نہ ہو
شیخ صاحب کی تملق کی نہ قلعی کھُل جائے
لاٹ صاحب کا کہیں حشر میں اظہار نہ ہو

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
دلکش و آزاد و خوشرو ساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقعِ عمل کے ہونگے پیش!
ہاں نگاہیں ہونگی مائل اُس طرف بیساختہ
مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے
ایک مُدت تک رہینگے نوجوان دل باختہ
اوجِ قومی سے شرافت کا سگر جائے گا
ماکیاں سے پست تر دکھلائی دیگی فاختہ
ڈالدے گا سینۂ غیرت سرِ میدان میں
تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سُو آختہ

مچھر بدن سے سب کے پیتا ہے خُون خالص | فضلہ اسے نہ سمجھو صاحب یہ بھِین کیوں ہے
اُڑنیکی طاقت اسکو فطرت نے کیوں عطا کی | یہ نشتر ملائم ایرو پلین کیوں ہے

مشرق غربی یہ پلیٹ میں ہے | دل سینے میں تھا سو پریٹ میں ہے
کیوں اُسکو ہے مولوی پر ترجیح | کیا بات گریجویٹ میں ہے
کیسہ خالی ہے بکس خالی
جو کچھ ہے یہاں پلیٹ میں ہے

اُلفت نہو شیخ کی تو عزت ہی سہی — مرشد نہ بناؤ اُن کو دعوت ہی سہی
بگڑا ہے جو دل زباں ہی کو روکو — رونا جو نہ آئے غم کی صورت ہی سہی

اذانوں سے سوا بیدار کُن انجن کی سیٹی ہے — اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے
کہاں باقی ہے ہم میں وہ اورادِ سحر گاہی — وظیفے کی جگہ یا پانیر یا I.D.T. ہے
گئے شربت کے دن یاروں کے آگے اب تو اے اکبرؔ — کبھی سوڈا کبھی لمنڈ کبھی وِسکی کبھی ٹی ہے

یورپ میں گو ہے جنگ کی قوت بڑھی ہوئی — لیکن فزوں ہے اُس سے تجارت بڑھی ہوئی
ممکن نہیں لگا سکیں وُہ توپ ہر جگہ — دیکھو مگر پیرس کا ہے سوپ ہر جگہ

مسمریزم کے عمل میں دہر اب مشغول ہے — مغرب و مشرق میں اک عامل ہے اک معمول ہے
جسم و جاں کیسے کہ عقلوں میں تغیر ہو چلا — تھا جو مکروہ اب پسندیدہ ہے اور مقبول ہے
مطلعِ انوارِ مشرق سے ہے خلقت بیخبر — متن پر تو وُہ ہے مغرب سے جو منقول ہے
گلشنِ ملت میں پامالی سرافرازی ہے اب — جو خزاں دیدہ ہے برگ اپنی نظر میں پھول ہے
کوئی مرکز ہی نہیں پیدا ہو پھر کیونکر محیط — جھول ہے پیچیدگی ہے ابتری ہے بھول ہے

قابلِ رشک ہے زمانے میں — دن وکیلوں کا رات عاشق کی

مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے — اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

بیدل ہمیں بروز سلونو شہ کیجئے　　لِللہ بات مانئے نونو نہ کیجئے
کل کی صدا نہ خوبی فطرت نہ لُطفِ دید　　بہتر یہی ہے خواہشِ فونو نہ کیجئے

ملک پر تاثیر جشنِ ووٹ طاری ہو گئی　　مُفت شیخ و برہمن میں فوجداری ہو گئی
ہندوؤنکو کیوں نہ اب بھائی بنائیں صلح دوست　　آریہ مذہب میں بھی توحید جاری ہو گئی
ممبری پر جناب ہوا ہمیں گئو، کا کیا قصور　　مُلک میں بدنام ناحق یہ بچاری ہو گئی
کرتے ہیں بائیسکل پر خوب وُہ دفع ریاح　　ابتو بیلن ارغنوں کا یہ سواری ہو گئی

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے　　بی۔اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

شوق ہے پن کا نہ طاقت پاپ کی　　سب ہیں بس بڑھتی مناتے آپ کی
ہو چکے ہُگلی کے ملچھ۔اب ہمیں　　فکر ہے گنگا کنارے جاپ کی
قطر جو کچھ ہو محیط اک اِنچ ہے　　دھوم ہے اُنکی کمر کی ناپ کی
شیخ جی قانع کے گھر میں لو جنم　　ورنہ اب مٹتی ہے ہستی آپ کی

عزیزانِ وطن کو پہلے ہی سے دیتا ہوں نوٹس　　چرٹ اور چائے کی آمد ہے حقّہ پان جاتا ہی
یہ اتنی گوشمالی طفلِ مکتب کی نہیں اچھی　　زباں آتی ہے اُسکو پیچ ہو لیکن کان جاتا ہی
مری ڈاڑھی سی رہتا ہے وہ بُت انکار پر قائم　　مگر جب دل دکھاتا ہوں تو فوراً مان جاتا ہی

وہ مس بولی میں کرتی آپکا ذکر اپنے فادر سے
مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے پاگل کا مافک ہے
نہ مانا شیخ جی نے چکھ گئے دس پانچ یہ کہکر
اگر قابض ہیں یہ بسکٹ تو ہوں اللہ مالک ہے

قلی اک اس طبیعت کا ملا جو کل یہ کہتا تھا
مرے دل میں خیالاتِ بلند آنے نہیں پاتے
سرِ مک پر کام میں تکلیف ہے بنگلے پہ بے لطفی
یہاں سایا نہیں ہے اور وہاں گانے نہیں پاتے

زندگی تھی ہی مصیبت موت بھی برباد ہے
کس قدر اس دَور میں بگڑا ہوا ہے دین ہائے
ماسٹر ہیں نزع میں لوگوں کی شامت دیکھئے
اُنکا فوٹو لیتے ہیں پڑھتے نہیں یٰسین ہائے

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

نہیں کچھ اسکی پرسش الفت اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپکی تنخواہ کتنی ہے؟

اب کہاں دستِ جنوں تارِ گریباں اب کہاں
پانیر اور دست مجنوں اور خبر ہے تار کی
لے لیا شیریں نے کمسریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا
ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی

ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی

تعارف

منشی درگا سہائے صاحب سرور ۱۸۷۳ء میں بمقام جہان آباد پیدا ہوئے آپکے والد حکیم پیارے لال صاحب اس قصبہ کے رئیس و زمیندار تھے۔ اوّل اوّل آپ نے وہیں پر تحصیل علم کا آغاز کیا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آپ فارغ البال تھے۔ جوانی کی اُمنگوں کے ساتھ شعر و شاعری کا اسقدر خیال تھا۔ کہ جہاں شام کے وقت چار احباب جمع ہوتے شعر و شاعری کے چرچے چھڑ جاتے۔ یہ آپ کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا لیکن پھر بھی کلام میں جدت کی جھلک دیکھ کر آپ کے احباب دنگ رہ جاتے تھے۔ اُستادوں کا کلام دیکھتے دیکھتے آپ کی نظر انتخاب بیان و یزدانی میرٹھ پر پڑی۔ اور اپنے آپکو بجائے خود اُن کا شاگرد قرار دیکر وحشت تخلص اختیار کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد سرور تخلص کرنے لگے۔ انہیں دنوں میں پنڈت لیکھرام جی کے قتل کا افسوسناک واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ اسپر آپ نے ایک زبردست مسدس لکھا۔ اُسکے ٹائیٹل پر آپ نے اپنے آپ کو بیان و یزدانی کا شاگرد ظاہر کیا تھا۔ اُن کے کچھ شاگرد یہ کتاب اُن کے پاس لے گئے۔ اور دریافت کیا کہ یہ آپ کے کون سے شاگرد ہیں۔ بیان و یزدانی نے جواب دیا۔ نہ میں انہیں جانتا ہوں۔ نہ میں نے اس میں اصلاح دی ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہے دیتا ہوں کہ یہ شاگرد

میرا نام روشن کریگا۔ اُن کی یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری اُتری۔ اور سرور کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ اُن کے کلام کو درج کرنا اخبارات و رسائل فخر سمجھتے تھے۔ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کو آپ کے اِنتقال پر قدردانانِ شاعری نے رنج و غم کے آنسو بہاکر آپکے زندہ جاوید کلام کی داد دی۔

زمزمۂ توحید

عقلِ دقیقہ رس کا دوڑا سمند برسوں رونداکیا جہان کے پست و بلند برسوں
ڈھونڈا کیا تجھے میں زار و نژند برسوں بامِ فلک پہ پھینکی اُڑ کر کمند برسوں
تیرا پتہ نہ پایا اے لامکان والے
سارے جہان میں ڈھونڈا سارے جہان والے

بُلبُل کا ہم نوا میں اکثر رہا چمن میں بیٹھا کیا بہت دن پھولوں کی انجمن میں
خلوت نشین رہا ہوں غنچوں کے پیرہن میں دوڑا کیا میں برسوں اِس وادیِ کہن میں
دُنیا کو چھان ڈالا تیرا پتہ نہ پایا
نقشِ قدم کا تیرے جلوہ نظر نہ آیا

اِک عمر بُتکدے میں رگڑا کیا جبیں میں کعبے میں بن کے بیٹھا اکثر حرم نشیں میں
برقِ خیال بن کر دوڑا تہِ زمیں میں تاروں کی انجمن میں برسوں رہا مکیں میں
لیکن کہیں تجلّی تیری نظر نہ آئی
وہم و گمان نے یارب! تیری نہ کُنہ پائی

جنگل میں آہ! برسوں دھونی رما کے بیٹھا پربت پہ بن کے جوگی آسن جما کے بیٹھا
صحرا کی وادیوں میں آنکھیں بچھا کے بیٹھا تیرے لیے جمیں ہو میں ہاتھ اٹھا کے بیٹھا

محوِ طلب رہا ہوں ویرانیوں میں برسوں
بیٹھا فقیر ہو کر میں تکیوں میں برسوں

تیرا نشان لیکن او بے نشاں نہ پایا وحدت کا آہ! تیری رازِ نہاں نہ پایا
خلوت نشینِ جہاں ہے تو، وہ جہاں نہ پایا وہ سرزمیں نہ پائی۔ وہ آسماں نہ پایا

ذروں میں اڑ کے چمکا تاروں میں جا کے جھلکا
جلوہ نظر نہ آیا پر شاہدِ ازل کا

چھوڑا کیا بہت دن سر شوقِ جبہ سائی لیکن نہ آستاں تک تیرے ہوئی رسائی
دیر و حرم میں برسوں کی قسمت آزمائی تیری مگر تجلی مجھ کو نظر نہ آئی

تو جلوہ گر کہاں ہے؟ او دو جہان کے مالک
شمس و قمر میں کیا ہے؟ او آسماں کے مالک

پھولوں میں آہ! کیا ہے موجِ شمیم تیری یارب ہے کس چمن میں بادِ نسیم تیری
غنچوں میں کیا ہے لوٹے رازِ قدیم تیری آرامگاہ ہے کیا باغِ النعیم تیری

تو عرش کی فضا میں ہے یا بہشت میں ہے
کعبے میں تجھ کو ڈھونڈوں یا تو کنشت میں ہے

آوارہ مدتوں سے ہوں تیری جستجو میں کھویا گیا ہوں اکثر میں کوئے آرزو میں
جلوہ نما ہے کیا تو پھولوں کے رنگ و بو میں کیا تیرے زمزمے ہیں بلبل کی گفتگو میں

ہیں محو ذوق تیری وحدت کے راگ کا ہوں

پروانہ آہ! تیری اُلفت کی آگ کا ہوں

حسرت کش تکلم ہے آہ! اِک زمانہ
ہے شیخ و برہمن کے لب پر ترا فسانہ
وحدت کا آہ تیری میں بھی سنوں ترانہ
کچھ سوزِ عاشقانہ۔ کچھ سازِ مطربانہ

پردے میں بانسری کی مجھ کو صدا سنا دے
بنسی بجانیوالے! وحدت کا گیت گا دے

ویدِ مقدس کی روشنی

ہُوا تیرے جلوے سے عالم منوّر
کہ چمکی ہمالہ کی تو چوٹیوں پر
وُہ گنگا کی لہریں سُہانی وُہ کرنیں
وُہ کہسار کا پُر فضا آہ! منظر
وُہ نُورِ سحر اور وُہ تیری تجلی
وُہ وادی وُہ جھرنے وہ پانی کی چادر
وُہ پھولوں کی خوشبو وُہ کویل کی کوکو
سُریلی وُہ تانیں پپیہے کے لب پر
وُہ دلکش فضائیں وُہ ٹھنڈی ہوائیں
وُہ جھونکے کہ جن سے تھا جنگل معطر
عجب صبح کا وُہ سُہانا سماں تھا
کہ اُتری تھی جب تو فلک سے زمیں پر
ہوئی بزمِ ہستی میں جب جلوہ آرا
تو دریا میں نورِ ازل کے نہا کر
سمجھ کر تجھے دیوتاؤں نے دیوی
پہنایا تجھے لاکے پھولوں کا زیور
وُہ قطرے جو تھے شب کی ظلمت میں پنہاں
زمیں پر چمکنے لگے بن کے اختر
زمیں پر جو نورِ ازل بن کے چمکی!
کئے تو نے استھان سارے منوّر
تری جوت پہ یاگ میں جا کے چمکی
زیارتکدے بن گئے تیرے مندر

ادائیں تری بے گئیں صاف دِل کو پہن کر جو تو گیسان کا نکلی زیور
اندھیری گوپھائیں ہوئی تجھ سے روشن کہ تو بن میں رشیوں کی چمکی جبیں پر
جو یونان میں بن کے تو شمع چمکی بنی ماہِ کامل عرب میں پہونچکر
جو گم گشتہ اِس دشت میں کارواں تھے بنی تو شبِ تار میں اُن کی رہبر
تجلّی تری مشرق سے غرب پہنچی خوشا تیرا جلوہ خوشا تیرا منظر
ترے حُسن کا خاص مرکز تھا بھارت نگاہیں زمانے کی پڑتی تھیں جس پر
وہ بھارت کہاں ہے وہ اگلا زمانہ نہ تو ہے نہ اب وُہ ترا پہلا منظر
نہ وُہ روشنی ہے نہ اب وُہ چمک ہے کہ چھائی ہوئی غم کی ظلمت ہی تجھ پر

بہت دن سے نظریں تجھے ڈھونڈھتی ہیں
چمک جا ہمالہ کی پھر چوٹیوں پر

موسمِ گرما کا آخری گلاب

یہ آخری گلاب کا ہے یادگار پھول اور شاخ پر کھلا ہوا تنہا چمن میں ہے
بیکس، غریب، فرقتِ احباب میں ملول دُھندلا سا اِک چراغ سحر انجمن میں ہے

ہے کوئی غمگسار، نہ ہمدم کوئی قرین بچپن کے آشنا ہیں نہ وُہ خانداں کے پھول
رخصت ہوئے چمن سے رفیقانِ ہم نشین بکھرے پڑے ہیں خاک پہ اب گلستاں کے پھول

ننھی سی کوئی آہ! کلی بھی نہیں قریب — ڈالے جو عکس پھول [illegible] غریب پر
کچھ درد دل کا حال کہے جس سے غم نصیب — جو اُسکی آہ سرد کو سُن کر ہو نوحہ گر

کملانے دونگا تجھ کو میں تنہا نہ شاخ پر — ڈر ہے۔ نہ کُنج میں تری مٹی خراب ہو
احباب سو رہے ہیں جہاں تیرے بیخبر — جا تُو بھی اُن کے ساتھ ہم آغوشِ خواب ہو

کب تک زبان پہ فرقتِ احباب کا گِلا — اب تیری پتیاں میں بچھاتا ہوں خاک پر
ہیں محوِ خوابِ مرگ جہاں تیرے آشنا — تُجھ کو بھی اُن کے ساتھ سُلاتا ہوں خاک پر

رختِ سفر اُٹھاؤنگا میں بھی جہاں سے جلد — احباب مجھ سے جب مرے ہو جائینگے جُدا
چھوٹونگا رنجِ ہجر کے دردِ نہاں سے جلد — تنہا کوئی جہاں میں جیا بھی تو کیا جیا

کیا لیکے کوئی آہ! کرے عمرِ جاوداں — ملکِ دنیا میں جب نہ رہے [illegible]
یاران رفتہ کا ہے زیارت کدہ جہاں — میری بھی بیکسی کا بنے گا وہیں مزار

جب اُٹھ گئے جہان سے یارانِ زندہ دِل — جی کر غمِ فراق کے صدمے سہیگا کون
کڑیاں تری اُٹھانیکو اے دردِ جاں گُسل — اِس غمکدے میں آہ! اکیلا رہیگا کون

---

۱۱ حسرتِ دیدار

وہ شانِ کجکلاہی، وہ فخرِ تاجداری　　وہ طرۂ زر افشاں، وہ تاجِ شہریاری
ممتاز آفت! وہ تیری دیرینہ غمگساری　　وہ تیری جاں نوازی، وہ میری جاں نثاری

قصے کہانیاں ہیں باتیں وہ اب کہاں ہیں
اے حسن و عشق تیری گھاتیں وہ اب کہاں ہیں

بے نام و بے نشاں ہوں بے تاج و بے نگیں ہوں　　پامال ہو چکا ہوں، وہ نقشِ دلنشیں ہوں
اک تنگ و تار حجرے میں آہ اب مکیں ہوں　　فریاد آتشیں ہوں، درد و دلِ حزیں ہوں

پنہاں ہوں آہ! اب میں سوزِ غمِ نہاں کا
رگ رگ میں مشتعل ہو شعلہ مری فغاں کا

رخصت طلب ہے مجھ سے اب آہ! عمرِ فانی　　مہماں ہے کوئی دم کی زنداں میں زندگانی
میں غم نصیب اپنی کس سے کہوں کہانی　　اک تیری آرزو ہے، اک حسرتِ جوانی

لیکن کہاں ہیں یہ دونوں خیال میرے
ارماں بھی مریں گے بعدِ وصال میرے

بیٹوں کا کشت و خوں اور دنیا کی بیوفائی　　اورنگ زیب کی وہ آہ اے وائے کج ادائی
ممتاز آہ! اسیر تیرا اور غمِ جدائی　　افتاد اک بہلن کی اس عمر میں اٹھائی

نیرنگیٔ جہاں کے نقشے ہزار دیکھے
پہلو میں بیکسی کے لاکھوں مزار دیکھے

میں کب سے منتظر ہوں اے مرگِ ناگہاں آ　　تکتا ہوں راہ تیری کب سے میں نیم جاں آ

ننھی سی کوئی آہ! کلی بھی نہیں قریب ڈالے جو عکس پھول سی صورت کا غریب پر
کچھ دردِ دل کا حال کہے جس سے غم نصیب جو اسکی آہ سرد کو سن کر ہو نوحہ گر

کمھلانے دونگا تجھ کو میں تنہا نہ شاخ پر ڈر ہے۔ نہ کنج میں تری مٹی خراب ہو
احباب سو رہے ہیں جہاں تیرے بیخبر جا تو بھی اُن کے ساتھ ہم آغوشِ خواب ہو

کب تک زبان پہ فرقتِ احباب کا گلا اب تیری پتیاں میں بچھاتا ہوں خاک پر
ہیں محوِ خوابِ مرگ جہاں تیرے آشنا تجھ کو بھی اُن کے ساتھ سلاتا ہوں خاک پر

رختِ سفر اٹھاؤنگا میں بھی جہاں سے جلد احباب مجھ سے جب مرے ہو جائینگے جدا
چھوڑونگا رہ کے ہجر کے دردِ نہاں سے جلد تنہا کوئی جہاں میں جیا بھی تو کیا جیا

نیا لیکے کوئی آہ! کرے عمرِ جاوداں سلکِ وفا میں جب نہ رہے دانۂ بزار
یارانِ رفتہ کا ہے زیارت کدہ جہاں میری بھی بیکسی کا بنے گا وہیں مزار

جب اٹھ گئے جہان سے یارانِ زندہ دل جی کر غمِ فراق کے صدمے سہیگا کون
گھڑیاں تری بتانیکو اے دردِ جاں گسل اس غمکدے میں آہ! اکیلا رہیگا کون

---

۱۱ حسرتِ دیدار

وہ شانِ کجکلاہی، وہ فخرِ تاجداری — وہ طرۂ ہند افشاں، وہ تاجِ شہریاری

ممتاز آہ! وہ تیری دیرینہ غمگساری — وہ تیری جاں نوازی، وہ میری جاں نثاری

قصّے کہانیاں ہیں باتیں وہ اب کہاں ہیں

اے حسن عشق تیری گھاتیں وہ اب کہاں ہیں

بے نام و بے نشاں ہوں بے تاج و بے نگیں ہوں — پامال ہو چکا ہوں، وہ نقشِ دلنشیں ہوں

رگ شکستہ تار جیسے میں آہ اب بنا ہوں — فریاد نشیں ہوں، اندوہ دل حزیں ہوں

پنہاں ہوں آہ! اب میں سوزِ غمِ نہاں کا

رگ رگ میں مشتعل ہو شعلہ مری فغاں کا

رخصت طلب ہے مجھ سے اب آہ! عمرِ فانی — مہماں ہے کوئی دم کی زنداں میں زندگانی

میں غم نصیب اپنی کس سے کہوں کہانی — اک تیری آرزو ہے، اک حسرتِ جوانی

لیکن کہاں ہیں یہ دونوں خیال میرے

ارماں بھی مر مٹیں گے بعد وصال میرے

بیٹوں کا کشت و خون اور دنیا کی بیوفائی — اورنگ زیب کی آہ! اے وائے کج ادائی

ممتاز آہ! اسیرِ تیرا غمِ جدائی — افتاد اک بہن کی اس عمر میں اٹھائی

نیرنگئ جہاں کے نقشے ہزار دیکھے

پہلو میں بیکسی کے لاکھوں مزار دیکھے

میں کب سے منتظر ہوں اے مرگِ ناگہاں آ — تکتا ہوں راہ تیری کب سے میں نیم جاں آ

مبتلا ہوں بیکسی کا میں زیرِ آسمان۔ آ
ہنستے ہیں وہ ظالم، تو رہ گئی کہاں۔ آ

دم بھر تھا نہیں چین اے چاندنی چمک جا
اے جانِ زار رخصت، اے آہ تا فلک جا

اتری ہے آسماں سے یا حور ہیں زمیں پر
اے تاج آہ! تو ہے خلد بریں زمیں پر
جلوہ فردوس ہے یا اک مہ جبیں زمیں پر
اک نقشِ حسن ہے یا کرسی نشیں زمیں پر

یا سازِ حسن کا ہے تو مجمد ترانہ
فردوس ناز کا ہے یا تو نگار خانہ

وہ دلربا مناظر ہیں یادگار تیرے
دلکش ہیں مورتوں سے نقش و نگار تیرے
آنکھوں میں پھر رہے ہیں لیل و نہار تیرے
شمس و قمر ہیں دونوں آئینہ دار تیرے

وہ رشکِ حور جب تھی محو خرام شب کو
اور دوش پر تھا گیسو کا دام شب کو

جھونکے ہوا کے بھینے بھینے وہ روح پرور
جمنا کی اف! آہ موجوں کا دلفریب منظر
فواروں کا اچھلنا، پھولوں کی نکہتِ تر
وہ چاندنی کا آنچل پھیلا ہوا زمیں پر

اک چاند کا نکھرنا۔ ایک چاند کا سنورنا
ہنس کر شہید مجھ کو تیغِ ادا سے کرنا

کچھ ناز، کچھ کرشمہ، کچھ شانِ بے نیازی
وقتِ خرام دلبر تیری وہ ترک تازی
ہونٹوں میں حیا فوازی آنکھوں میں سحر سازی
وہ شوخیِ تبسم اور وہ فسوں طرازی

بلبل سے چھیڑ کرنا، پھولوں سے مسکرانا
شرمیلی چتونوں سے، وہ میرا دل لبھانا

معکوس اپنی کر دے رفتار عمر رفتہ　　اُس نازنیں کو کر لوں پھر پیار عمر رفتہ
پھر حسن و عشق کا ہو اظہار عمر رفتہ　　شوق و حجاب کی پھر تکرار عمر رفتہ

کیا بازگشت تیری ممکن نہیں جوانی
تو مجھ کو کس پہ چھوڑے جاتی ہے عمر فانی

پہلو میں میرے آجا اے جانِ جاں کہاں ہے　　تکتا ہوں راہ تیری آنکھوں میں میری جاں ہے
کس خواب ناز میں ہے آنکھوں سے کیوں نہاں ہے　　تاریک تیرے غم میں نظروں میں اک جہاں ہے

افسوس اٹھتے دم تو ارمان نظر کا نکلے
سینہ پہ ہاتھ رکھ دے کانٹا جگر کا نکلے

اے کاش! تجھ سے ہنس کر میں ہم کلام ہوتا　　روضہ میں ساتھ تیرے محوِ خرام ہوتا
ہوتا کنار جمنا، اور وقت شام ہوتا　　اور چاند آسماں پر بالائے بام ہوتا

تو مجھ کو پیار کرتی، میں تجھ کو پیار کرتا
قدموں پہ جان شیریں تیرے نثار کرتا

آ! دو گھڑی کو آجا ہوں دو گھڑی کا مہماں　　پھر مل کے کر لیں ہم تم عیش و طرب کے ساماں
ہر چند بے بقا ہے لطف و نشاط دوراں　　دنیا کی دو گھڑی کی بھی مغتنم ہیں خوشیاں

آ! چاندنی میں دلکش ہے کیا بہار جمنا
جام وصال پی لیں بھر کر کنار جمنا

اے کاش! تیری الفت دل چیر کر دکھاتا　　چھلنی ہے سو جگہ سے تجھ کو جگر دکھاتا
عالم جو یاس کا ہے پیش نظر دکھاتا　　نیرنگ میں تجھے بیدادگر دکھاتا

جنت میں روح تیری ہے آہ کیا کہوں میں

تو خوابِ ناز میں ہے قیدِ جفا میں ہوں میں

گنبد مزار کا ہے تیرے جو یہ سمن بر | حوریں چڑھا رہی ہیں پھولوں کی جس پہ چادر
اے سروِ باغِ خوبی، اے غیرتِ گلِ تر | تجھ کو پکارتا ہوں میں تیرا نام لے کر

کانوں میں بازگشت اک آواز آ رہی ہے
تیرا پیامِ اُلفت تجھ کو سنا رہی ہے

ہے منتظر یہاں یہ جانِ نزار تیری | آنکھوں میں بس رہی ہے اے گل! بہار تیری
میں راہ دیکھتا ہوں لیل و نہار تیری | دل پر ابھی محبت ہے یادگار تیری

آنکھیں وہیں ہیں میری اے جان! تو جہاں ہے
تیرے ہی پاس میرا جسم اور میری جاں ہے

مُرجھا رہے جو یہ گل تیرے مزار پر ہیں | سوزِ درون کا مرہم، جان و دل و جگر ہیں
بو اُن میں ہے وفا کی، یہ میری چارہ گر ہیں | راحِ مشامِ جاں ہیں، دامن کشِ نظر ہیں

یہ ان گلوں کی نازک جو پنکھڑیاں ہیں
مہندی بھری یہ تیری گویا ہتھیلیاں ہیں

ہوتی ہے آہ! قالب سے جانِ زار رخصت | پہلو سے صبر رخصت، دل سے قرار رخصت
اے آہ! اے فغاں! اے شبہائے تار رخصت | دُنیا سے ہو رہا ہوں بیگانہ وار رخصت

آ میری جان تجھ کو جی بھر کے پیار کر لوں
آ ایک بار تجھ کو پھر ہمکنار کر لوں

میں آہ! لوٹتا ہوں سوزِ غمِ نہاں سے | شعلے نکل رہے ہیں ایک ایک استخواں سے
ہاں قند گھول دے پھر لعلِ شکرفشاں سے | ارشاد مسکرا کر ہو مجھ کو کچھ زباں سے

یک بار دیکھ لے تو پھر پیار کی نظر سے
تیرِ نگاہ گزرے دِل چیر کر جگر سے

روضہ پہ چاند تیرے کرنیں گرا رہا ہے — شفاف چاندنی کی چادر چڑھا رہا ہے
مکھڑے کا تیرے مجھ کو جلوہ دِکھا رہا ہے — جمنا کی دلفریبی کیا کیا بڑھا رہا ہے
ہے دِل کے آئینے میں عکسِ جمال تیرا
بیتاب کر رہا ہے شوقِ وصال تیرا

جسطرح آہ! تیرے سنسان مقبرے پر — دھندلی سی شمع روشن ہو ایک اک گُلِ تر
پڑتا ہے سنگِ مرمر پر جس کا عکس باہر — خوں رونیوالے میرے یونہیں یہ دیدۂ تر
ہیں آہ! اس اُداسی پر ٹکٹکی لگائے
تیری لحد کو بن کر چادر جو ہیں چھپائے

زیرِ زمیں جو تجھ کو پنہاں کئے ہوئے ہے — جو تیرے غم میں مجھ کو نالاں کئے ہوئے ہے
ہستی کا چاک میرے داماں کئے ہوئے ہے — رختِ سفر کا میرے ساماں کئے ہوئے ہے
چھائی ہوئی ہے دِلبر تیرا خیال بن کر
اندوہِ یاس بن کر رنج و ملال بن کر

فرقت نصیب ہوں میں اے کاش! موت آئے — بندِ غم و الم سے آکر مجھے چھڑائے
ہیں مر رہا ہوں، مجھ کو تجھ سے اجل ملائے — نظروں سے چھپنے والے جلوہ ترا دکھائے
دُنیا میں غیر ممکن ہے اب وصال تیرا
خلدِ بریں میں دیکھوں مر کر جمال تیرا

شجر جھومتے ہوں غنچے کھلے ہی ہوں — خوشبو ہو بھینی بھینی کلیاں مہک رہی ہوں

شبنم کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی ہوں سبزے پہ موتیوں کا پانی چھڑک رہی ہوں

معروف آہ! ہم تم گلگشت باغ میں ہوں

دامن میں پھول چنتے کنجِ فراغ میں ہوں

سرشارِ عشق ہوں میں تو مستِ جامِ اُلفت دیتی ہوں مل کے نظریں دل کا پیامِ اُلفت

ہو آہ! لطفِ صحبت، شربِ مدامِ اُلفت دل ہو اسیرِ گیسو، گیسو ہو دامِ اُلفت

غمّاز دوسرا ہو کوئی نہ انجمن میں

محوِ خرام ہم تم دونوں ہوں اک چمن میں

گنگا جی

اے آبِ رودِ گنگا! اے ری تری صفائی یہ تیرا حسن دلکش! یہ طرزِ دلربائی

تیری تجلّیاں ہیں جلوہ فروشِ معنی تنویر میں ہے تیری اک شانِ کبریائی

جمنا تری سہیلی گو ساتھ کی ہے کھیلی اسمیں مگر کہاں ہے تیری سی جانفزائی

بے لوث تیرا دامن ہے داغِ معصیت سے موزوں ہے تیرے قد پر ملبوس پارسائی

حسنِ ازل کی گویا تو اک سگھڑ ہے مورت صانع نے تیری صورت کیا موہنی بنائی

اے نازشِ زمانہ! اے نقشِ نازِ عصمت! بھارت کی پاک دیوی تو ہے ہماری مائی

دلبند ہم ہیں تیرے لختِ جگر ہیں تیرے

نخلِ مراد ہے تو اور ہم ثمر ہیں تیرے

مینو سواد تجھ سے ہیں وادیاں ہماری اور کشتِ آرزو ہے رشکِ جناں ہماری

وُہ دن بھی ہوگا، ہونگے جب ہم غریقِ رحمت — آہ تیری نذر ہونگی یہ ہڈیاں ہماری
گنگا میں پھینک آنا بعدِ فنا اشاکر — برباد ہو نہ مٹی، اے آسماں ہماری

یارب! نہ دفن کرکے احباب بھول جائیں
لیکر ہمارے خوش خوش گنگا کو پھول جائیں

او پاک نازنیں! او پھولوں کے گہنے والی — سرسبز وادیوں کے دامن میں بہنے والی
او ناز آفریں! او صدق و صفا کی دیوی — او عفتِ مجسّم پربت کی رہنے والی
صلِّ علیٰ! یہ تیری موجوں کا گنگنانا — وحدت کا یہ ترانہ او چپ نہ رہنے والی

حسنِ غیور تیرا ہے بے نیازِ ہستی
تو بحرِ معرفت ہے او پاکبازِ ہستی

ہاں تجھ کو جستجو ہے کس بحرِ بیکراں کی — ہم پر تو کچھ حقیقت کھلتی نہیں جہاں کی
اے پردہ سوزِ امکاں! اے جلوہ ریزِ عرفاں — تو شمعِ انجمن ہے کس بزمِ دلستاں کی
کیوں جادۂ حباب میں چلتی کشاں کشاں ہے — تجھ کو تلاش ہے کس گم گشتہ کارواں کی

جاتی ہے تو کہاں کو، آتی ہے تو کہاں سے
وابستگی ہے تجھ کو کس بحرِ بے نشاں سے

آئی نظر تجلّی جب شاہدِ ازل کی — ذرّوں میں جا کے چمکی پھولوں میں جا کے جھلکی
ہندوستان ہے اک دریائے حسنِ قدرت — اور اسمیں پنکھڑی ہے تو خوشنما کنول کی
نکلی ہمالیہ سے محوِ خروش ہوکر — تو آہ! تشنہ لب تھی وہ جلوۂ ازل کی

کرتی ہوئی زمیں پر موتی نثار آئی
درشن کو آہ ہر کے تو ہردوار آئی

یہ جوشِ سبزۂ گُل، یہ تیری آبیاری — قدرت کے چپّہ چپّہ پر یہ شگوفہ کاری
ہندوستاں کو تُونے جنّتِ نشاں بنایا — نہریں کہاں کہاں ہیں تیرے کرم کی جاری
اَے آبِ رودِ گنگا! موجوں میں تیری مل کر — موجِ سرابِ ہستی ہو بے نشاں ہماری

بعدِ فنا ہمارے پھُولوں میں بُو ہو تیری
گُم ہوں رہِ طلب میں اَور جستجو ہو تیری

آئے اجل کی زد پہ جب اپنی عمرِ فانی — اَور ختم رفتہ رفتہ ہو سیلِ زندگانی
دُنیا سے آہ! جب ہو اپنے سفر کا سامان — بالیں پہ اقربا ہوں سرگرمِ نوحہ خوانی
جب ہونٹ خُشک ہوں اَور دشوار ہو تنفّس — احباب اپنے مُنہ میں ٹپکائیں تیرا پانی

ہنستے ہوئے جہاں سے ہم شادکام جائیں
دُنیا سے پی کے تیری اُلفت کا جام جائیں

ستی

اَے ستی! اَے جلوہ گاہِ شعلۂ تنویرِ حُسن — پاک دامانی کا نقشہ ہے تری تصویرِ حُسن
یہ تنِ نازک ترا، یہ شعلہ ہائے آتشیں — یہ چتا کی آتشِ سوزاں یہ جسمِ نازنیں
صاعقہ ہی برق کا تیرے دلِ مضطر کی آگ — پھونکدیتی ہے تجھے تیرے غمِ شوہر کی آگ
خاک ہو کر بھی ترے داغِ جگر بجھتے نہیں — آہ! تیری راکھ کے برسوں شرر بجھتے نہیں
ہند کو ہے ناز تیری ہمّتِ مردانہ پر — تو چراغِ کشتہ ہے خاکسترِ پروانہ پر
آگ میں ہے تو سینۂ شوق جلنے کیلئے — شمعِ ماتم ہے شبِ غم میں پگھلنے کے لئے

گرمیِ ہنگامۂ محشر تری محفل میں ہے　　سرد جو ہوتی نہیں وہ آگ تیری دل میں ہے

کب گوارا آہ! ہے سوزِ غمِ شوہر تجھے　　ہے ہر اک تارِ نفس اک شعلۂ مضطر تجھے

اُف ری! شوہر کی چتا پر شعلہ افروزی تری　　جیتے جی سوزِ محبت میں جگر سوزی تری

جان گدازی کی ادا یہ شمعِ محفل میں کہاں　　گرمیِ سوزِ وفا یہ شمعِ محفل میں کہاں

وہ چتا کی آتشِ جان سوز، وہ دودِ سیاہ　　شوہرِ مردہ کا سر وہ زانوِ نازک پہ آہ

آگ کے وہ بڑھتے شعلے اور وہ مکھڑا چاند سا　　لب پہ کم کم شوخیِ برقِ تبسم کی ادا

ہلکا پھلکا جسمِ نازک پر دوپٹہ سرخ سرخ　　وصلِ روحانی کی شادی سے وہ چہرہ سرخ سرخ

عالمِ دودِ سیہ وہ زلفِ عنبر فام میں　　دوڑنے والے وہ شعلے حلقہ ہائے دام میں

آتشِ سوزاں میں بھی وہ آہ شوہر کا خیال　　اور وہ دل میں گرمیِ ہنگامۂ شوقِ وصال

جل کے سوزِ اضطرابِ شوق میں پروانہ وار　　خلد میں شوہر سے ہونا اُف! وہ خوش خوش ہمکنار

ڈال دینا وہ گلے میں ہنس کے باہیں پیار سے　　دل لبھا لینا ادائے شیوۂ گفتار سے

ہلکی ہلکی چاندنی کیفیتِ گلگشتِ باغ　　وہ لب جو آہ! حسن و عشق کے دو شب چراغ

تجھ پہ اے ناز آفریں شوہر پرستی ختم ہے　　اک شرارِ آرزو میں تیری ہستی ختم ہے

آہ! اے شمعِ محبت! نکتہ آموزِ وفا　　ہے جگر سوزی تری کاشانہ افروزِ وفا

آہ! اے عفت کی دیوی! اے زیارت گاہِ خلق　　آہ! اے جانبازِ شوہر! اے عقیدت گاہِ خلق

دیوتا کھاتے ہیں تیری پاکبازی کی قسم　　پاکدامانی کی شانِ بے نیازی کی قسم

ایک سایہ سا لگا رہتا تری مندر میں ہے　　محوِ خوابِ جان فزا تو پہلوئے شوہر میں ہے

یادگارِ سوزِ الفت ہیں غمِ شوہر کے داغ　　جل رہے تیرے شوالے میں ہیں یا گھی کے چراغ

تیرے تنبد پہ برستے آسماں سے پھول ہیں
اے ستی مصئون تری جو رخزاں سے پھول ہیں

پدمنی

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم اور پروانوں کو دی سوزِ وفا کی تعلیم
جب ہر اک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم آئی حصے میں ترے ذوقِ فنا کی تعلیم

نرم و نازک تجھے اعضا دئے جلنے کیلئے
دل دیا آگ کے شعلوں پہ پگھلنے کیلئے

رنگ تصویر کے پردے میں جو چمکا تیرا خود بخود لوٹ گیا جلوۂ رعنا تیرا
ڈھال کر کالبد نور میں پتلا تیرا ید قدرت نے بنایا جو سراپا تیرا

بھر دیا کوٹ کے سوزِ غمِ شوہر دل میں
رکھ دیا چیر کے اک شعلۂ مضطر دل میں

تو وہ عشقِ شمع کہ پروانہ بنایا تجھ کو تو وہ لیلیٰ تھی کہ دیوانہ بنایا تجھ کو
رونقِ خلوتِ شاہانہ بنایا تجھ کو نازشِ ہمتِ مردانہ بنایا تجھ کو

ناز آیا ترے حصے میں ادا بھی آئی
جاں فروشی بھی، محبت بھی، وفا بھی آئی

آئی دنیا میں جو تو حسن میں یکتا بنکر چمنِ دہر میں پھولی گلِ رعنا بنکر
رہی ماں باپ کی آنکھوں کا جو تارا بنکر دلِ شوہر میں رہی خالِ سویدا بنکر

حُسنِ خدمت سے شگفتہ دلِ شوہر رکھا
کہ قدم جادۂ طاعت سے نہ باہر رکھا

تیری فطرت میں مُروّت بھی تھی۔ غمخواری بھی ‏ تیری صورت میں ادا بھی تھی۔ طرحداری بھی
جلوۂ حُسن میں شامل تھی نکوکاری بھی ‏ درد آیا ترے حصّے میں، تو خودداری بھی

آگ پر بھی نہ تجھے آہ! مچلتے دیکھا
تپشِ حُسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

تو وہ عصمت کی تھی اور آئینہ سیما تصویر ‏ حُسنِ سیرت سے تھی تیری مُتجلّا تصویر
لاکھ تصویروں سے تھی اک تری زیبا تصویر ‏ تجھ کو قدرت نے بنایا تھا سراپا تصویر

نور ہی نور ترے جلوۂ مستور میں تھا
انجمِ ناز کا جھرمٹ رُخِ پُر نور میں تھا

لب پہ اعجازِ حیا چشمِ فسوں ساز میں تھی ‏ کہ قیامت کی ادا تیرے ہر انداز میں تھی
شکل پھرتی جو تری دیدۂ غمّاز میں تھی ‏ برق بیتاب تری جلوہ گہِ ناز میں تھی

یہ وہ بجلی تھی قیامت کی تڑپ تھی جس میں
شعلۂ نازِ عقوبت کی تڑپ تھی جس میں

یہ وہ بجلی تھی جو تیغ شرر افشاں ہوکر ‏ کوندا اُٹھی قلعہ چتوڑ میں جولاں ہوکر
یہ وہ بجلی تھی جو سوزِ غمِ حرماں ہوکر ‏ خاک سی لوٹ گئی تیری پشیماں ہوکر

یہ وہ بجلی تھی، تجھے جس کے اثر نے پھونکا
رفتہ رفتہ تپشِ سوزِ جگر نے پھونکا

آہ! اے عشوہ و انداز و ادا کی دیوی ‏ آہ! اے ہند کے ناموسِ وفا کی دیوی

آہ! اے پیکرِ انوارِ صفا کی دیوی　　او زیارت کدۂ شرم و حیا کی دیوی
تیری تقدیس کا قائل ہے زمانہ ابتک
تیری عفت کا زباں پر ہے فسانہ ابتک
آفریں ہے تری جاں بازی و ہمت کیلئے　　آفریں ہے تری عفت تری عصمت کیلئے
کیا مٹائے گا زمانہ تری شہرت کیلئے　　کہ چلی آتی ہے اک خلق زیارت کیلئے
نقش ابتک تری عظمت کا ہے بیٹھا دل میں
تو وہ دیوی ہے، ترا لگتا ہے میلا دل میں

حسرتِ شباب

۱۲

نہ چال میں ہے وہ شوخی نہ قد میں رعنائی　　کہ تیرے ساتھ گئی آہ! شانِ برنائی
کہاں چھپا ہے تو اے محوِ جلوہ آرائی　　بیا کہ باز ببینیم جو پردہ بکشائی
زمیں پہ فرش رہِ انتظار ہیں آنکھیں
کہ دیکھنے کو تجھے بیقرار ہیں آنکھیں
وہ صحبتیں ہیں نہ اگلی سی وہ ملاقاتیں　　مزے سے کٹتی تھیں یاروں کیساتھ جب راتیں
بتوں سے ملنے کی اب سوجھتی نہیں گھاتیں　　کہ تیرے ساتھ گئیں حسن و عشق کی باتیں
لہو ٹپکتا ہے آنکھوں کے آبگینوں سے
کہ گرم صحبتِ مے اب کہاں حسینوں سے
نہ زورِ آہ ہے اب وہ نہ شور نالوں کا　　کہ سر میں اب نہیں سودا پری جمالوں کا

وہ خارِ غم نہیں پھولوں کے گہنے والوں کا رہا نہ ذوقِ خلش اب وہ دل کے چھالوں کا
کسی کی یاد میں بےخوابیاں کہاں شب کو
کہ اب وہ اگلی سی بیتابیاں کہاں شب کو

وہ ولولے وہ اُمنگیں وہ آرزو نہ رہی جگر کے داغوں میں وہ سوندھی سوندھی بُو نہ رہی
زباں پہ ساغر و مینا کی گفتگو نہ رہی کہ دل میں اب ہوسِ شیشہ و سبو نہ رہی
کہاں وہ آہ! شراب و کباب کے جلسے
کہ ختم ہو گئے عہدِ شباب کے جلسے

نہ چھیڑ مطربِ رنگیں نوا ترانۂ عشق مجھے دماغ کہاں جو سُنوں فسانۂ عشق
گیا شباب کے ہمراہ کارخانۂ عشق کہ مجھ سے چھوٹ گیا آہ! آستانۂ عشق
جگر میں وہ تپش دردِ جانگزا نہ رہی
سوار سر پہ جو تھی، عشق کی بلا نہ رہی

وہ بھینی بھینی نسیم سحر وہ بادِ وزان مشام روح میں جھونکے تھے جسکے عطر فشان
وہ مرغزار، وہ صحرا، وہ تختۂ ریحان سحر کی اب وہ ہوا خوریوں کا لُطف کہاں
وہ جھوم جھوم کے چلنا نسیم کا سن سے
سمن بروں کا نکلنا وہ بیچ کے دامن سے

وہ اودی اودی گھٹائیں وہ سبزہ صحرا وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہ نور کا تڑکا
علی الصباح وہ قدرت کی دیکھنے کو فضا نکل کے گھر سے وہ بے اختیار چل دینا
وہ سیر کرتے ہوئے دشت میں نکل جانا
پلٹ کے جانبِ دریا وہاں سے پھر آنا

وہ سطحِ آب وہ موجیں، وہ جوشِ طغیانی وہ آبشار وہ جھرنے، وہ خوشنما پانی
وہ آفتاب کی کرنوں کی جلوہ افشانی وہ طائرانِ چمن زاکی زمزمہ خوانی
پری وشوں کا وہ پنگھٹ پہ جوق جوق آنا
سبو وہ دوش پہ پانی کے بھر کے لے جانا

کہاں وہ صبح کی اگلی سی دلفریب فضا کہ تیرے ساتھ ہوا خوریوں کا لطف گیا
نہ ناشتہ میں ہے لذت، نہ چاشت میں ہے مزا ترے مذاق سے تھا آہ! ذوقِ آب و غذا
اتر کے حلق سے لقمہ فرو نہیں ہوتا
پیو تو زہر ہلاہل ہے انگبیں ہوتا

وہ رنگ روپ وہ شوخی، وہ خط و خال کہاں کہ اب وہ دورِ جوانی، وہ سن وہ سال کہاں
چمن میں غنچۂ یارانِ ہم خیال کہاں وہ سیرِ باغ وہ اٹھکھیلیوں کی چال کہاں
چلوں نہ راہ میں کیوں میں نحیف رک رک کر
کہ تیر ساتھا جو قد، ہو گیا کماں جھک کر

وہ دل بغل میں جو تھا شیشۂ مئے انگور ہوا وہ سنگِ حوادث پہ گر کے چکنا چور
وہ سر پہ طرہ کج ہے، نہ وہ کلاہِ غرور کہ بارِ خاطرِ نازک ہے اب قبائے سمور
گرائے دیتا ہے رعشہ زمین پہ پیری کا
اجل سے کہدو کہ موقع ہے دستگیری کا

کہاں ہے آہ! تو عہدِ شباب۔ واویلا کہ چلدیا مجھے کر کے خراب۔ واویلا
نہ یار ہے، نہ شبِ ماہتاب۔ واویلا کہ تیرے ساتھ گیا لطفِ خواب۔ واویلا
جو کھیل کود میں میرا سنِ نمو گزرا
تو حسن و عشق کے جھگڑوں میں آہ! تو گزرا

پنڈت برج نرائن صاحب چکبست لکھنوی

تعارف

آپ کشمیری پنڈت ہیں۔ لفظ چکبست آپکا عرف ہے تخلص نہیں۔ ستائیس اٹھائیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ آپکی ایک ایک نظم اور ہر ایک نظم کا ایک ایک مصرعہ حد درجہ مؤثر اور پُر درد ہوتا ہے۔ ممدوح کی نظموں میں حُب وطن، قدرتی مناظر ادب و اخلاق، جوش و ایثار کی چلتی پھرتی تصاویر عام ہیں۔ اور حسن و عشق اور زلف و خال کے افسانے نہایت کم۔ واقعات کے نظم کرنے میں آپ کی قابلیت کا یہ حال ہے کہ ایک ہی بات کو پہلو بدل بدل کر متواتر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اپنے پڑھنے والے کو تھکنے نہیں دیتے۔ انکے بیان میں شیرینی اور دلفریبی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ اور جذبات لہریں مارتے ہیں۔ مگر انکساری کا یہ عالم ہے کہ اپنے آپ کو شاعر کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔ آج کل لکھنؤ میں وکالت کرتے ہیں۔ اور ایک سیاسی رسالہ صبح اُمید کے ایڈیٹر ہیں۔

وید

فیضِ قدرت سے جو تقدیر کھلی عالم کی
ساحلِ ہند پہ وحدت کی تجلی چمکی

مٹ گئی جہل کی شب صبح کا تارہ چمکا
آریہ ورت کی قسمت کا ستارا چمکا

اہلِ دل پر ہوئی کیفیت عرفاں طاری
جن سے دُنیا میں ہوئیں دین کی نہریں جاری

تھیں کھلی جلوہ گہِ خاص میں راہیں اُنکی
واقفِ رازِ حقیقت تھیں نگاہیں اُن کی

عرش سے اُن کے لئے نورِ خدا آیا تھا
بندۂ خاص تھے رشیوں کا لقب پایا تھا

وید اُن کے دلِ حق کیش کی تصویریں ہیں
جلوۂ قدرتِ معبود کی تفسیریں ہیں

عین کثرت میں یہ وحدت کا سبق وید میں ہے
ایک ہی نور ہے جو ذرّہ و خورشید میں ہے

جس سے اِنسان میں ہے جوشِ جوانی پیدا
اُسی جوہر سے ہے موجوں میں روانی پیدا

رنگ گلشن میں فضا دامنِ کہسار میں ہے
خون رگِ گُل میں ہے نشتر کی خلش خار میں ہے

تمکنت حسن میں ہے جوش ہے دیوانے میں
روشنی شمع میں ہے نور ہے پروانے میں

رنگ و بو ہو کے سمایا وہی گلزاروں میں
ابر بنکر وُہی برسا کیا کہساروں میں

شوق ہو کر دلِ مجذوب پہ چھایا ہے وُہی
درد بن کر دلِ شاعر میں سمایا ہے وُہی

نورِ ایمان سے جو پیدا ہو صفا سینے میں
عکس اس کا نظر آتا ہے اس آئینے میں

کشمیر

پانی میں ہے چشموں کے اثر آبِ بقا کا ہر نخل پہ عالم خضرِ سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نور خدا کا سائے میں شجر کے ہے اثر ظلِ ہما کا
مبداء کرم عام کی ہر جوئے رواں ہے
سرچشمۂ فیض چمن آرائے جہاں ہے

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا چشموں سے پہاڑوں کے وہ اُڑتا ہوا پھینا
گاتے ہوئے ملاحوں کا وہ کشتیاں کھینا ڈل[1] کا وہ سرِ شام ادھر کروٹیں لینا
وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آنا

ہر لالۂ کہسار ہے شکلِ گُلِ راحت داغ اُس کے ہیں خالِ رخِ حورائے مسرت
کیا سبزۂ خوش رنگ ہے سرمایۂ عشرت دل کے لئے ٹھنڈک ہے جگر کیلئے فرحت
ایسا نہیں قدرت نے کیا فرش کہیں پر
اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں روئے زمیں پر

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق کوہ پہ لالے کا لہکنا مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا
ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیمِ سحری کا

[1] ایک جھیل کا نام ہے۔

وہ نالۂ کہسار لب چشمۂ کہسار — وہ سرد ہوا وہ کرم ابر گہر بار
وہ میوۂ خوش رنگ وہ سرسبز چمن زار — اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار
یہ باغ وطن رشکِ گلزار جناں ہے
سرمایۂ نازِ چمن آرائے جہاں ہے

ہے خطۂ سرسبز میں اک نور کا عالم — ہر شاخ و شجر پر شجر طور کا عالم
پروین ہے یہ خوشۂ انگور کا عالم — ہر خار پہ بھی ہے مژۂ حور کا عالم
نکلے نہ صدا ایسی مغنی کے گلو سے
آتی ہے جو آواز ترنّم لبِ جو سے

میووں سے گرانبار وہ اشجار کے ڈالے — بکھرے ہوئے وہ دامنِ کہسار پہ لالے
اڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے چھالے — دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے
وہ ابر کے ٹکڑوں کا تماشا شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ مہلّو نکلے دروں میں

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گذرا ہے زمانہ — تازہ ہے مگر اس کی محبت کا فسانا
عالم نے شرف جن کی بزرگی کا ہے مانا — اٹھے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا
تن جن کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون انہیں کا

ہاں میں بھی ہوں بلبل اسی شاداب چمن کا — ہے چشمۂ فردوس یہ عالم ہے دہن کا
کس طرح نہ سرسبز ہو گلزار سخن کا — ہے رنگ طبیعت میں چمن زار وطن کا
تازے ہیں مضامین بھی طبیعت بھی ہری ہے

ہاں گلشنِ قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

۱۳.

گائے

تو وہ مخلوق ہے خلقت میں نہیں جس کی گناہ　　لی ہے قالب میں ترے روحِ محبت نے پناہ
تیری صورت سے عیاں ہوتی ہے انساں کی چاہ　　رس بھری آنکھ سموئی ہوئی امرت میں نگاہ

نقش ہے دل پہ مرے موہنی صورت تیری
خوب دنیا کے شوالے میں ہے مورت تیری

تن سے تیرے ہے عیاں نرمیِ دل کا جوہر　　جوڑ بند ایسے کہ سانچے میں بنے ہیں ڈھل کر
رنگ کالا ہو کہ اجلا ہو یہ کہتی ہے نظر　　بندرابن کی وہ ہے شام یہ متھرا کی سحر

کنگرے سے یہ نہیں چہرۂ نورانی پر
تاج قدرت نے رکھا ہے تری پیشانی پر

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار　　بے پیے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار　　وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کا نکھار

ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
پی کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں　　چشمۂ فیضِ خدا مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحی شعرا کہتے ہیں　　ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیرا ہے

آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

نام جس کا ہے محبت وہ ہے ایماں تیرا کوئی ہو سب کے لئے فیض ہے یکساں تیرا
زندگی کے لئے محتاج ہے انساں تیرا کون بیمار نہیں بندۂ احساں تیرا

حلق میں دودھ سے تیرے جو تری رہتی ہے
خشک ٹہنی تنِ لاغر کی ہری رہتی ہے

صورتیں یاد ہیں اُن بچوں کی پیاری پیاری زندگی کی جنہیں ایک ایک گھڑی تھی بھاری
تیرے دم سے نہ رہی یاس کی حالت طاری ہو گئیں اُن کے لئے دودھ کی نہریں جاری

کتنے گرتے ہوئے پودوں کو سنبھالا تو نے
ماں جنہیں چھوڑ چلی تھی اُنہیں پالا تو نے

تیرے بچوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار اپنی گردن پہ لیا پرورشِ قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیار ہے یہ سب اُن کے لہو اور پسینے کی بہار

اُن کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا
ہند کی خاک اُگلتی نہ خزانا اپنا

اہل دیں نے تجھے جنت کا سہارا سمجھا اپنے ایمان کی قسمت کا ستارا سمجھا
سوا بیروں نے تجھے جان سے پیارا سمجھا تجھ کو اکبر نے سدا آنکھ کا تارا سمجھا

آبرو قوم کی ہے تیری نگہبانی پر
یہی دو حرف لکھے ہیں تری پیشانی پر

مثل بچوں کے ترے دودھ کے ہیں متوالے جو ضعیفی سے پڑے رہتے ہیں بستر والے
مست رہتے ہیں ترے فیض سے کس بل والے پیار سے کہتے ہیں ماتا تجھے بچے بالے

میرے دل میں ہے محبت کا تری سرمایا ماں کے دامن سے ہے بر [illegible]
یاد ہے فیض طبیعت نے جو تجھ سے پایا عین قسمت جو ترا نام زباں پر آیا
اِس حلاوت سے جو دعوائے سخنگوئی ہے
دودھ سے تیرے لڑکپن میں زبان دھوئی ہے

رامائن کا ایک سین

(راجہ رامچندر کا ماں سے رخصت ہونا)

رخصت ہُوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اُداس تو غم ہوگا اور بھی
دِل کو سنبھالتا ہُوا آخر وہ نونہال خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہُو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے
کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بیگناہ نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ

بنے رزم کی راہ

ہر دے ن زبان کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا　　افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا　　وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں　　میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں　　لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید　　اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید　　سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید
لکھی ہے کیا حیاتِ ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم　　ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم　　تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم

ا بھرت جی کی ماں کیکئی کی طرف اشارہ ہے جن کی ضد سے مجبور ہو کر راجہ دسرت نے رامچندر جی کو بن باس کا حکم دیا تھا اور بھرت جی کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔

میں خوش ہوں پھونکدے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال　　دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال　　آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کیواسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کیواسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر　　گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر　　یہ جانے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ　　منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و امان کی راہ　　اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالق عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُنکر زبان سے ماں کی یہ فریاد درد خیز　　اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز　　لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بے کس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اَور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور　　مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور

صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دُور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ چھل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر ہونا جو ہے سب اُس کے بہانے ہیں سربسر
اسباب ظاہری ہیں نہ اِن پر کرو نظر کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اُس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تُم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دُنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب جن سے کہ بیگناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ درون سے قلب و جگر ہو گئے کباب پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ مُنہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی قائم تھیں جن کے دم سے اُمیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑ کر نہیں پڑی ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گُل ہوئے رنگِ حیات سے
اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کیتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گذرتے ہی ماہ و سال
خود دل سے دردِ ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہُوا کیا
آخر کو روکے بیٹھ رہے اور کیا کیا
پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اُس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہوکے ہوتے ہیں انسان گناہگار
یہ جانتے نہیں وُہ ہے دانائے روزگار
انسان اُس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وُہی ہے امر رضا میں جو خم رہے
اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شادکام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قایم اُمید ہی سے ہے دُنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں
اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم اُنہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وُہ گُل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز اُنہیں اپنی جان کی طرح
مِلتے ہیں دستِ یاس وُہ برگ خزاں کی طرح
لیکن جو پھُول کھلتے ہیں صحرا میں بیشمار
موقوف کچھ ریاض پہ اُن کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
وُہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِّ کریم کا

موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نِگاہ ہے کرم کارساز پر　　صحرا چمن بنے گا وُہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر　　رہتا نہیں وُہ حال سے بندے کے بیخبر
اُس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

ماں کا جواب

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر　　ہنس کر وفورِ یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرہ پہ یُوں ہنسی کا نمایاں ہُوا اثر　　جس طرح چاندنی کا ہو شمشان[1] میں گذر
پنہاں جو بیکسی تھی وُہ چہرہ پہ چھا گئی
جو دل کی مُردنی تھی نِگاہوں میں آگئی
پھر یہ کہا کہ مَیں نے سنی سب یہ داستان　　لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیان[2]
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحان　　بچے ہو اِس کا علم نہیں تم کو بے گمان
اِس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ ماّمتا[3] کی آنچ کی تُم کو خبر نہیں
آخر ہے عُمر ہے یہ مرا وقت واپسیں　　کیا اعتبار آج ہوں دُنیا میں کل نہیں
لیکن وُہ دن بھی آئیگا اِس دِلکو ہے یقیں　　سوچو گے جب کہ روئی تھی کیوں مادرِ حزیں
اَولاد جب کبھی تمہیں صُورت دکھائیگی
فریاد اِس غریب کی تب یاد آئیگی

[1] مرگھٹ۔ [2] علمِ الہی کا سبق۔ [3] ماں کی محبت کا قدرتی جذبہ۔

جو حد سے گذر جاتی ہے وہ اسکی طلب ہے

جو لوگ مئے حرص سے دنیا میں ہیں سرشار	جینے کی لطافت سے نہیں اُن کو سروکار
مانند گدا زر کے ہیں ہر وقت طلبگار	آزاد کہاں دام طمع میں ہیں گرفتار

محروم مئے عیش سے یہ خستہ جگر ہیں
مالک نہیں زر کے ہیں فقط بندۂ زر ہیں

دولت وُہ ہے مجبور کی جو عقدہ کشا ہو	اکسیر ہو دردِ دلِ بیکس کی دوا ہو
آئینۂ اخلاق و محبت کی جلا ہو	ظلمات فلاکت کے لئے آبِ بقا ہو

یُوں فیض کے چشمے ہوں رواں باغ وطن میں
جیسے کرم ابرِ گہربار چمن میں

ہر صبح گلستان میں بصد شان فصاحت	بلبل گلِ رنگین سے یہ کرتی ہے حکایت
دیکھو چمن آرائے دو عالم کی عنایت	گھٹتے کبھی دیکھی نہیں فیاض کی دولت

گو کم دُرِ خوش آب لٹانا نہیں ہوتا
خالی کبھی شبنم کا خزانہ نہیں ہوتا

نذرانۂ رُوح ؟!

دلِ پُر درد کے ٹکڑے جو کئے ہیں یکجا	تیرے قدموں کے لئے تھا یہی میرا تحفا
مگر افسوس کہ یہ دین ادا ہو نہ سکا	اب سرِ لوح پہ ہے نقش یہ پیغامِ وفا

میرے سودائے طبیعت کا جو افسانہ ہے

مرنے والے یہ تری رُوح کا نذرانہ ہے

طائرِ فکر ترے اَوج سے حیران رہا تیرا بندہ رہے دل سے یہی پیمان رہا
یہی مسلک یہی مذہب یہی ایمان رہا قدر کرنا تری سیکھیں یہی ارمان رہا

آبرو کیا ہے تمنّائے وفا میں مَرنا
دین کیا ہے کِسی کامل کی پرستش کرنا

دل کے مندر کا اُجالا ہے یہ تصویرِ کمال اب پرستش کو ہے باقی تری ہستی کی مثال
مگر اِس خاک کے پتلے کی ہے تسکین مُحال گو کہ یہ رُوح کا سودا ہے بلا خوف و زوال

یاد مٹتی نہیں تیری دِرِ حسرت وا ہے
ہم کو معلوم ہُوا آج یتیمی کیا ہے

حسرت آباد جہان سے تجھے کیا ہاتھ آیا مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا
زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا میں کہوں گا کہ بس اک رہبرِ کامل پایا

لیکے دُنیا سے یہی مہرِ وفا آیا ہُوں
اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہُوں

خود بخود جان ہوئی جاتی ہے سینہ میں ہلاک دل یہ کہتا ہے کہ جینے کی لطافت نہیں خاک
چڑھکے غیروں کی نظر پر نہ ہوں آنسو ناپاک یہ مگر شرطِ وفا ہے نہ ہوں آنکھیں نمناک

جسکی دُنیا کو خبر ہو یہ وہ ناسُور نہیں
تیرے ماتم کی نمائش مجھے منظور نہیں

برسات

ہے دلاتی یادِ مے نوشی فضا برسات کی ۔ دل بڑھا جاتی ہے آ آ کر گھٹا برسات کی

بندھ گئی ہے رحمتِ حق سے ہوا برسات کی ۔ نام کھلنے کا نہیں لیتی گھٹا برسات کی

اُگ رہا ہے ہر طرف سبزہ در و دیوار پر ۔ انتہا گرمی کی ہے اور ابتدا برسات کی

دیکھنا سوکھی ہوئی شاخوں میں بھی جان آ گئی ۔ حق میں پودوں کے مسیحا ہے ہوا برسات کی

ہو شریکِ بزمِ مے زاہد بھی توبہ توڑ کر ۔ جھوم کر قبلے سے اُٹھی ہے گھٹا برسات کی

وصل تو یوں ہو مے و معشوق کا جب لطف ہے ۔ چاندنی ہو رات کو دن کو گھٹا برسات کی

وہ پپیہوں کی صدائیں اور وہ موروں کا رقص ۔ وہ ہوائے سرد وہ کالی گھٹا برسات کی

پار اُتر جائیں گے بحرِ غم سے رندِ بادہ نوش ۔ لے اُڑے گی کشتیِ مے کو ہوا برسات کی

خود بخود تازہ اُمنگیں جوش پر آنے لگیں ۔ دل کو گرمانے لگی ٹھنڈی ہوا برسات کی

وہ دُعائیں مے کشوں کی اور وہ لطفِ انتظار ۔ ہائے کن نازوں سے چلتی ہے ہوا برسات کی

میں یہ سمجھا ابر کے رنگین ٹکڑے دیکھ کر ۔ تختِ پریوں کے اُڑا لائی ہوا برسات کی

ناز ہو جس کو بہارِ مصر و شام و روم پر
سرزمینِ ہند میں دیکھے فضا برسات کی ۔ ۱۵

شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

تعارف

ولادت ۱۸۳۱ء۔ وطن دہلی۔ سنِ وفات ۱۹۱۰ء۔ اردو علم ادب میں آپ کا نام آفتاب کی مانند روشن ہے۔ آپ نثر کے نئے ڈول کے موجد ہیں۔ مگر نظم بھی کہتے تھے۔ اور حق تو یہ ہے کہ خوب کہتے تھے۔ مولانا حالی کے رہنما آپ ہی تھے۔ حضرت نے اُستاد ذوق کے سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور نکات عروض وشعر وسخن بھی اُنہیں کے فیض سے حاصل کئے۔ اِس کے بعد آپ پر کوہِ مصائب ٹوٹ پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے پہلے حضرت لکھنؤ پہنچے لیکن گردشِ تقدیر نے دم نہ لینے دیا۔ اِدھر اُدھر پھرتے رہے آخرکار ۱۸۶۴ء میں قسمت جاگی اور لاہور آکر سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور یونیورسٹی کالج میں صیغۂ علوم ہند میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہاں اُنہوں نے قصص ہند کا دوسرا حصہ تصنیف کیا جو آپ کی لیاقت و زباندانی پر دال ہے۔ اِسکے علاوہ آبحیات اور نیرنگ خیال نامی رسالے لکھے۔ جن سے حضرت کا نام زندہ جاوید ہو گیا ہے۔ آپ کی نظمیں اُس زمانہ میں بالکل نئے رنگ کی تھیں۔ اور اب بھی کہ کئی دور گذر چکے ہیں۔ اُنکی شان دلاویزی کم نہیں ہوئی۔

جیسے چاہو سمجھ لو

قلم مرقع عبرت نیا دکھاتا ہے — اور ایسے شخص کا ایک ماجرا سناتا ہے
کہ سب تمہارا سا تھا کارخانہ اُسکے لئے — یہی زمیں تھی یہی تھا زمانہ اُسکے لئے
فنا کے سایہ میں کرتا وہ زندگانی تھا — جو پوچھو کون؟ تو سمجھو تمہیں سا فانی تھا
مٹا یا گردش گردوں نے آہ نام اُس کا — نہ آج نام ہے اُس کا رنہ کچھ مقام اُس کا

پر اتنا سچ ہے کہ غمگین و شاد ہونے سے — خوشی کے ہنسنے سے اور درد و غم کے رونے سے
کبھی اُمید سے اور گاہ نا اُمیدی سے — کبھی خطر کی خبر گاہ خوش نویدی سے
جو ایک رنگ تھا آتا تو ایک جاتا تھا — خیال اس کا مرقّع نیا بناتا تھا
یہ دل جو سینہ میں جنبش سے دمبدم کرتا — کہ ہے اسی پہ ہر ایک زندگی کا دم بھرتا
دماغ میں جو خیالوں کا آنا جانا ہے — کوئی یقیں ہے کوئی وہم کا فسانہ ہے
ہمائے ہمت عالی کا اوج پر جانا — کبھی بہ جبر کبھی خود بخود اُتر آنا
غرض اُٹھاتا یہ کیفیتیں ضرور تھا وہ — کہ آغرش یہی انسان باشعور تھا وہ

جو تم ہو دیکھ رہے وہ یہ سب ہے دیکھ چکا — جہاں کے شام و سحر روز و شب ہے دیکھ چکا
جو کچھ کہ سہتے ہو تم آج سہہ چکا ہے وہ — جو کچھ کہ آج ہو تم ایسا رہ چکا ہے وہ
مگر میں کیا کہوں تجھ کو تو اب یہ رونا ہے — کہ جو وہ آج ہے ایک دن وہ تم کو ہونا ہے

یہ روز و شب کہ مہ و سال کے حساب میں ہیں — یہ سال و ماہ جو مہ و مہر کے انقلاب میں ہیں
بہت سے میوے بہت سے اناج دیتے ہیں — بہاریں سر سبزہ کو تاج دیتے ہیں
یہ فرشِ خاک کہ سب کاروبار ہیں جس پر — یہ ابر و باد کہ سارے مدار ہیں جس پر
جب اُس کے طوقِ گلو زندگی کا قصہ تھا — تو ساری محنتوں سے لیتا اپنا حصہ تھا
یہ سب کچھ اب بھی ہے پر اُسکو کچھ خبر بھی نہیں — جو ہو تو نفع نہیں گر نہو ضرر بھی نہیں
بلا سے اس کی زمانہ ابھی فنا ہو جائے — دیا کہ ملک فنا گلشنِ بقا ہو جائے
وُہ آپ ہی جب نہُوا پھر جہاں ہُوا نہ ہُوا — زمیں ہوئی نہ ہوئی آسماں ہُوا نہ ہُوا

یہ صبح و شام جو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں — یہ سال و ماہ کی فصلیں جو آتی جاتی ہیں
یہ مہر و ماہ کہ جن سے جہان روشن ہے — ستارے جن سے زمین آسماں روشن ہے
کسی میں دور کا اِس کے نشاں نہیں باقی — پتا تلک بھی نہ آسماں نہیں باقی
قضا نے ہائے الٰہی کہاں چھپایا اُسے — زمین کھا گئی یا آسماں نے کھایا اُسے

کسی کے حسنِ پریوش کا وُہ دیوانہ تھا — اور اُس کے تیرِ ادا کا ہُوا نشانہ تھا
پر اب جو دیکھو تو وُہ غیرتِ پری بھی نہیں — وُہ اُس کے ناز وہ انداز دلبری بھی نہیں
فنا کے بزم میں ساقی نے اُس کو جام دیا — مرض کا نام کیا موت کا پیام دیا
طبیب آئے تھے لیکن کوئی دوا نہ چلی — خود آیا حُسنِ سفارش کو پر ذرا نہ چلی
فلک نے موت کا جام آخرش پلایا اُسے — وہاں گور سے گویا زمیں نے کھایا اُسے

ازل کی صبح کہ جس میں جہاں ہُوا پیدا — اور اُس کے ساتھ ہی گویا ہوئی فنا پیدا
کتاب عمر جہاں آج تک پڑھی میں نے — ورق ورق ہے یہ تاریخ دیکھ لی میں نے
ہر اک کا راز ہے اس میں کہیں کہیں کھلتا — پر اُس غریب کا احوال کچھ نہیں کھلتا

بہت ہوں فکر سے کہتا کہ کچھ بتا تو سہی
ہے وُہ بھی اتنا ہی کہتا کہ کوئی تھا تو سہی

ایک تارے کا عاشق

ایک سخنور کسی تارے کا تماشائی تھا — اُس کے دیدار کا دلدادہ و شیدائی تھا
دل سے وُہ چاند کا ٹکڑا اُسے بھایا ہُوا تھا — اَور وُہی رات دن آنکھوں میں سمایا ہُوا تھا
وُہ ستارا کہ ہُوا آنکھوں کا تارا تھا اُسے — چشمِ حیرت میں نظارے کا سہارا تھا اُسے
اوجِ معنی سے مضامیں تھا اُتارا کرتا — اور اُنہیں اپنے ستارہ پہ تھا وارا کرتا
چشمِ حیرت سے نظر اس پہ سدا کرتا تھا — دل کے سب ناز و نیاز اس سے ادا کرتا تھا
غم جو ایک شب اُسے بیتاب و تواں کرنے لگا — مُنہ ہی مُنہ میں یہ سخن اُس سے بیاں کرنے لگا
ہے تو تُو رشکِ پری غیرتِ صد حُور ہے تُو — مگر اس عاشقِ دلدادہ سے کیوں دُور ہے تُو
مُنہ تیرا مہر صفت ہیگا دمکتا پیارے — سرد مہری سے مگر کیوں ہے جھپکتا پیارے
اے وہ تو جس پہ کہ قابو کی کوئی بات نہیں — چشمِ حسرت کے سوا حرف و حکایات نہیں
ہیں جو ارمان بھرے دل میں نکالوں کیونکر ق — ہائے چھاتی سے تجھے اپنی لگا لوں کیونکر
دم نکل جائے تو ہو یار مُبارک مرنا — یوں ہو مرنا تو ہے سو بار مُبارک مرنا

یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے　　آب رواں ہیں چشموں سے بہ کر نکل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے　　جو تھم رہے یہاں وُہی خود در وحل رہے

تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے　　چمکایا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نُور ہونے لگا فتحیاب ہے　　اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے

تم بھی ہو آفتاب درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے　　اب خاتموں پہ آ گئے ہیں اُن کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے　　وُہ گونجا طبل فتح کہ میدان لے لئے

ہے کرنائے جنگ کی الحاں چلے چلو
کرنا یا ئے

مثنوی شرافت حقیقی　۱۷.

میں پُوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا　　نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
نہ خانوادہ سے مطلب نہ خانمان سے غرض　　یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ ہے نشان سے غرض
تمہارے کام گر اچھے تو نام اچھے ہیں　　گھرانے اچھے۔ گھر اچھے۔ تمام اچھے ہیں

جہاں کی دولت و حشمت کا یاں خیال نہیں　　امیر ہو کہ فقیر۔ اِس سے کچھ سوال نہیں
کوئی امیر اگر ہے تو اپنے گھر بیٹھے　　بزرگ صاحبِ زر ہے تو لیکے زر بیٹھے
یہاں تو مایۂ ہمت میں جو زیادہ ہے　　بزرگ امیر ہے اور خود امیر زادہ ہے

مجھے نہیں ہے یہ پروا کہیں سے آئے کوئی
کہیں سے بارِ توطن اُٹھا کے لائے کوئی
جو پاک نہر ہے اور آب صاف چلتا ہے
تو کیوں یہ پوچھیں کہ چشمہ کہاں نکلتا ہے
درخت سے نہیں کچھ کام جبکہ پھول ہو تم
کمال اصل تو جب ہے کہ با اصول ہو تم

عدم سے آ کے کس خاک پر گرے پہلے
وُہ کیا زمین تھی جس پر قدم پھرے پہلے
گزارا تم نے لڑکپن ہے قصرِ شاہی میں
کہ جھونپڑوں میں پلے خواری و تباہی میں
مجھے نہ فخر ہے اُس کا۔ نہ عار ہے اِس کی
مگر تلاش ہے تو بار بار ہے اس کی
کہ رکھتے ملکِ مروت میں رسم و راہ ہو کیا
دکھاتے ہمتِ عالی میں دستگاہ ہو کیا

میں پوچھتا نہیں تاجر کہاں سے ہے آیا
گماشتہ ہے کہ رکھتا ہے گھر کا سرمایا
نہیں تلاش کہ لایا ہے ساتھ کیا چیزیں
سبک سبک ہیں وہ یا ہیں گرانبہا چیزیں
میں چاہتا نہیں ارزاں یہ شے دلا دو مجھے
خدا کے واسطے اتنا کوئی بتا دو مجھے
متاعِ حسن و دیانت دکان میں ہے کہ نہیں
وفا کی جنس بھی اِس کلبداں میں ہے کہ نہیں

یہ مانا میں نے کہ باعقل و ذی شعور ہو تم
مقام تجربہ کاری میں پہنچے دُور ہو تم
نہ کچھ مقدمہ فہمی سے رکھتا کام ہوں میں
نہ کرتا ضابطہ دانی میں کچھ کلام ہوں میں
پر اُس کو خود غرضی میں نہ خرچ کرنا تم
کسی کے خون میں ناحق نہ ہاتھ بھرنا تم
زیادہ عقل زیادہ خراب کرتی ہے
ثواب ہائے خدا کو عذاب کرتی ہے

مجھے غرض نہیں کالج میں تُم پڑھے کہ نہیں
جماعتوں کے مدارج پہ تُم چڑھے کہ نہیں

کتابیں پڑھکے جو کیں حفظ بر زباں تو کیا
اَور اُن میں پاس ہوئے دیکے امتحاں تو کیا

تُمہارے خلق پہ بھی کچھ اثر ہُوا کہ نہیں
زباں سے کہنے کی دل تک صدا گئی کہ نہیں

فقط جو عالم ذی شان ہو گئے تو کیا
میرے حسابوں وُہ شیطان ہو گئے تو کیا

جو کچھ کہ مُنہ سے کہو اُس کا لو اثر دل میں
کہ ہے کتابوں میں جو کچھ کرے وُہ گھر دل میں

زبان و دل میں ہم جب کہ ایک ہو جاتے
تو آدمی بھی ہیں بالطبع نیک ہو جاتے

وگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں
ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

جو مجھ سے پُوچھو تو ہے پھر بھی ناتمام وُہ علم
تمام جب ہو کہ پہنچائے فیض عام وُہ علم

وُہ علم جس سے کہ اَوروں کو فائدہ نہ ہُوا
ہمارے آگے برابر ہے وُہ ہُوا نہ ہُوا

مجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم۔ کہ کچھ بھی نہو
مگر یہی ہے تمنّا کہ ایسے ہو کے رہو

میانِ جلسہ جو آزاد پُوچھے آکے کبھی
کہو۔ کسی میں لیاقت ہو گر یہ کہنے کی

کہ باصفا۔ وسبک رُوح وپاک جان ہم ہیں
توتم جواب میں جھٹ بول اُٹھو کہ ہاں ہم ہیں

حبِّ وطن

دلّی کہ جو ہمیشہ سے کانِ کمال ہے — جو باکمال اس میں ہے وہ بے مثال ہے

اک شخص واں ستار نوازی کی جان تھا — پر جان سے عزیز تھا دلّی کو جانتا

آیا دکن سے خلعت و زر اُس کے واسطے — اور نقد بہرِ زادِ سفر اس کے واسطے

ہر چند منہ تو دلّی سے موڑا نہ جاتا تھا — پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا

مطلب یہ ہے کہ بعد بہت قیل و قال کے — اسباب سارا راہِ سفر کا سنبھال کے

دلّی کو یہ بھی چھوڑ کے سوئے دکن چلے — پر جیسے چھوڑ کر کوئی بلبل چمن چلے

پہنچے مگر ابھی تھے درِ راج گھاٹ پر — جو دفعتاً نظر پڑی دریا کے پاٹ پر

دریا کی لہریں دیکھ کے لہرایا اُنکا دل — اور دلّی چھوڑتے ہوئے بھر آیا اُنکا دل

منہ پھیر کر نگاہ جونہی شہر پر پڑی — جلوہ دکھاتی جامع مسجد نظر پڑی

تب وہ پیامبر کہ جو آیا دکن سے تھا — اور اُن کو لے چلا وہ چھڑا کر وطن سے تھا

دیکھا نگاہِ یاس سے اور اُس سے یہ کہا — پیچھے چلینگے پہلے مگر یہ تو دو بتا

ایسی تمہارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں — منہ دیکھکر وہ اُن کا ہنسا اور کہا نہیں

پھر سوئے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا — مسجد بھی اس طرح کی دکھا دوگے واں بھلا

وہ شخص مسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے — اس خانۂ خدا کا تو ثانی محال ہے

ہے اپنی طرز میں یہ نرالی جہان سے — اُتری زمیں پہ جسکی شبیہ آسمان سے

یہ بات اسکی سنتے ہی چیں بر جبیں ہوئے — اور پھر خبر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے

جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں نہیں — سنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا وہاں نہیں

اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب ہوں | پر اس چمن کو چھوڑ کے ہم کیوں خراب ہوں
اور گاڑی اپنی تو بھی میاں گاڑیبان پھیر | گر اب پھرے نہ یہاں سے تو قسمت کا جان پھیر
ہم اپنی دلی چھوڑ دکن کو نہ جائیں گے | گر یہاں بہت کھائینگے تھوڑا ہی کھائینگے

ایسے ہی تنگ حُبِ وطن بدنصیب ہیں | گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں
کہتے ہیں دکھ اٹھانا ہو یا درد سہنا ہو | تھوڑا سا کھانا ہو پہ بنارس میں رہنا ہو
اب میں تمہیں بتاؤں کہ حُبِ وطن ہے کیا | وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا

لکھتے ہیں اس طرح سے مؤرخ فرنگ کے | دانا رموز معرکۂ صلح و جنگ کے
یعنی یورپ کے ملک میں دو تاجدار تھے | دونو کے اہلِ ملک بگرجاں نثار تھے
سرحد پہ کچھ فساد تھا پر ایسا پڑ گیا | دونو کے اتفاق کا نقشہ بگڑ گیا
آخر کو تھے جو واقفِ اسرار سلطنت | سمجھے بہم یہ مصلحت کار سلطنت
دو جاں نثارِ ملک روانہ اُدھر کریں | اور اپنے دو اِدھر کو وہ گرم سفر کریں
تا چاروں جس جگہ کہ بہم ایک بار ہوں | سرحد ملک کے وہیں قائم منار ہوں
جانباز اس طرف کے مگر جان توڑ کر | ایسے اُڑے کہ پیچھے ہوا کو بھی چھوڑ کر
ایک حصّہ بھی نہ رستہ حریفوں نے تھا کیا | یہ تین حصہ بڑھ گئے اور اُن کو جا لیا
لیکن حریف شرط کے میداں کو چھوڑ کے | بولے یہ عہدِ قول و قرار اپنا توڑ کے
دو اپنے اپنے ملک کے جو جاں نثار ہوں | پھر اب کے دو طرف سے رواں ایکبار ہوں
پر اپنی بات پہلے ہر ایک شخص جان لے | اور یہ ارادہ خوب طرح دل میں ٹھان لے

یعنی جو شرط جیت کے خورسند ہوئیگا — سرحد پہ وُہ زمین کا پیوند ہوئیگا
جانباز آئے تھے جو ابھی راہ مار کے — حب الوطن کے جوش سے بولے پکار کے
جو شرط اب لگائی ہے تم نے یہی سہی — اور بات جو کہ ہونی ہے پھر وُہ ابھی سہی
پر بیچ میں نہ حیلہ حوالہ کی آڑ دو — سرحد ہماری ہو چکی بس ہم کو گاڑ دو
حاصل یہ ہے کہ دونو اسی جا پہ اڑ گئے — جیتے کے جیتے مُلک کی سرحد پہ گڑ گئے

اور ہے لکھا مورخ عہد قدیم نے — روما پہ کی جو فوج کشی ایک غنیم نے
تیار اہلِ فوج پئے کارزار تھے — پر اہلِ ملک ان سے سوا جاں نثار تھے
آیا حریف جب کہ نہایت قریب شہر — اُٹھے برائے جنگ امیر و غریب شہر
پر اُن میں کوکلیز جو مردِ دلیر تھا — حب الوطن کے حق میں نیستاں کا شیر تھا
نِکلا وہ سجکے اسلحۂ جنگ شہر سے — اور لشکر عدو کی طرف آیا قہر سے
دو جاں نثار حُبّ وطن اور ساتھ تھے — اعدا کے خُوں میں ڈوبے سدا جنکے ہاتھ تھے
ہے جیسا بحر گنگ کا مائی لقب یہاں — تھے ٹائیبر کو باپ کہا کرتے سب یہاں
وُہ بحر نیچے شہر کے تھا اوج موج پر — پُل سے اُتر کے آئے یہ دشمن کی فوج پر
پُل کا دہانہ روک کے تیغوں کے گھاٹ سے — اعدا کے خُون بہاتے رہے کاٹ کاٹ کے
اور اپنی فوج کو یہ پُکارے کہ آؤ تم — حملہ تو ہم نے روک لیا پُل گراؤ تم
مسمار اِدھر وُہ کرتے رہے پُل کو آنکر — یہ تیر و نیزے مارے گئے تان تان کر
پُل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہ گیا — ایک آدمی کا راہگذر جسکو رہ گیا
تب کوکلیز یاروں سے بولا کہ جاؤ تم — اے میرے پیارے ہموطنو غم نہ کھاؤ تم

قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو۔ چھوڑ دو مجھے | تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے
ایک ایک رفیق جب کہ اِدھر پار ہو گیا | اور پل جو کچھ رہا تھا وہ مسمار ہو گیا
للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے | اور ٹاپئیر میں کھیلے یہ کودا دھڑام سے
ٹالا ہے تو نے سر سے عدو کی تباہی کو | اے میرے باپ لیجیو اپنے سپاہی کو
دشمن کی فوج تیغیں سنبھالے ہی رہ گئی | اور موت اپنے دانت نکالے ہی رہ گئی
دیکھو توفیض حبِ وطن اس کو کیا ملا | جھٹ چار ہاتھ مار کے یاروں میں جا ملا

گر اس ہوا میں رکھتے ہو دلِ لالہ زار تم | اور ہو یہ تیغ حبِ وطن دل فگار تم
ایرانیوں کے عہد کیانی کو دیکھ لو | اِس بحر سلطنت کی روانی کو دیکھ لو
کیا کیا مخالفوں سے بچایا ہے ملک کو | کیا کیا عروج دیکے بڑھایا ہے ملک کو
کیا کیا مخجل کیا ہے سپہرِ بنفش کو | کیا کیا شکوہ دی ہے کیانی درفش کو
اعدا کے خوں سے تیغیں ہیں کیا آبدار کیں | کیا کیا وطن کے نام پہ جانیں نثار کیں
ان میں بھی سیستان کے بہادر وہ شیر تھے | جن سے کہ ایک جہاں کے زبردست زیر تھے
کرتے تھے عیش دامنِ کوہسار میں کبھی | اور لوٹتے تھے سبزۂ گلزار میں کبھی
مثل غزال دشت میں کرتے کلیل تھے | جنگِ پلنگ و شیر انہیں بچوں کے کھیل تھے
آبِ رواں پہ لیتے بہاروں کے لطف تھے | تیر و کماں سے لیتے شکاروں کے لطف تھے
پر سنتے جب کہ شاہ بعزمِ غنیم ہے | یا یہ کہ اپنے ملک کی حالت سقیم ہے
درد و الم میں ہوں کہ نشاط و سرور میں | ہوں گھر میں یا کہ وادئ نزدیک و دور میں
جس حال میں ہوں بے سروپا اٹھکے دوڑتے | روئے زمیں سے مثل ہوا اٹھ کے دوڑتے

آغا محمد شاہ صاحب حشر کاشمیری

تعارف

آبائی وطن تو کشمیر ہے۔ لیکن ایک عرصہ سے اُن کے خاندان کا مسکن بنارس ہے۔ آغا صاحب کا مقامِ ولادت امرت سر ہے۔ فن شعر میں جہاں تک معلوم ہوسکا ہے۔ آپ نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ لیکن اِسکے باوجود نظم و نثر دونوں میں کمال حاصل کرچکے ہیں۔ آپ کی عمر ۴۵ - ۴۶ سال کی ہے۔ اور اسوقت تک کئی ڈرامے تصنیف کرچکے ہیں۔ جن کو لوگوں نے اسقدر پسند کیا ہے کہ اِسوقت دُنیائے ناٹک میں آپ کا نام جادُو کا سا اثر رکھتا ہے! وَ بلاشُبہ آپ کے قلم میں وُہ زور ہے جو کسی دیگر اُردو ناٹک نویس کو حاصل نہیں۔ شیکسپیئر کے چند ناٹکوں کا ترجمہ آپ نے اِس حُسن خوبی سے کیا ہے۔ کہ بے اختیار قلم چُوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ حشر کے ڈراموں نے سٹیج پر یُوں حشر برپا کردیا ہے۔ تماشائی دیکھتے ہیں اور سر دُھنتے رہ جاتے ہیں۔

ذیل میں ہم آغا صاحب کے ایک مقبول انام ڈراما جُرمِ اُلفت کا ایک مبین نقل کرتے ہیں۔ جن سے ان [illegible] رِ قلم کا پتہ لگ سکے گا۔

سین جُوئے خانہ

(افضل شراب میں مست کھڑا ہے)

افضل۔ دُنیا کی بیشمار زبانیں یکساں لفظوں میں اس جگہ کے خلاف اپنا غصّہ اَور نفرت ظاہر کر رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ جگہ بُری ہے۔ یہاں جُوا کھیلا جاتا ہے۔ جُوا ایک درخت ہے۔ جو کوتہ فہم ہاتھوں سے لالچ کی زمین پر بویا جاتا ہے۔ پانی کے بدلے دَولت و عزّت کے خون سے سینچا جاتا ہے۔ اَور بڑا ہو کر مفلسی بے عزّتی اَور تباہی کا پھل لاتا ہے۔ آہاہا کیسے جج اَور کیسا عجیب فیصلہ ہے۔ میں اُن نامنصف مزاج ججوں سے پُوچھتا ہُوں کہ اگر یہ جگہ جُوا خانہ ہونے کی وجہ سے سوسائٹی کی مجرم ہے تو تمہیں تمام جہان کے برخلاف فردِ جُرم لگانی چاہیئے۔ جواب دو۔ کیا یہ تمام دُنیا جُوا خانہ نہیں ہے۔ کیا اِس دُنیا میں ہر ایک شخص ایک دُوسرے کیساتھ داؤ نہیں کھیل رہا ہے۔ بادشاہوں کے دربار میں وزیروں کے محل میں فوج کے کیمپ میں۔ سوداگروں کی دوکان میں۔ غرض ہر ایک جگہ قسمت کی بساط پر کوشش کا پانسہ نہیں پھینکا جا رہا ہے۔ کیا ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو ہر بڑی طاقت چھوٹی طاقت کو ہر بڑی عقل والا چھوٹی عقل والے کو پُورا نگل جانے، جیت لینے اَور برباد کر دینے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ سب جُواری ہیں۔ جُوا کھیلتے ہیں۔ بادشاہ طاقت سے بہادروں سے سپاہی تلوار سے کھیلتا ہے۔ مدبر قلم سے کھیلتا ہے۔ فیلسوف دماغ سے کھیلتا ہے۔ بس اگر ملعون ہیں تو سب۔ ورنہ کوئی نہیں۔ بُرائی ہے تو ہر ایک جگہ۔ ورنہ کہیں نہیں۔ اِس لئے افضل خُوب پی

خوب کھیل اور جس طرح ہاتھی کے پیچھے کتے بھونکتے ہیں۔ اور وہ پرواہ نہیں کرتا۔ اسی طرح تو بھی دنیا والوں کو اپنے پیچھے بکنے دے۔ اور آگے بڑھا چل۔ بوائے۔

بوائے۔ یس سر

افضل۔ ہاف مور

بوائے۔ ماسٹر سات پیگ پی چکے۔ کیا ابھی بس نہیں۔

افضل۔ اَبے تجھے وعظ کی ڈیوٹی کب سے ملی جو شراب کے بدلے نصیحت کا گھونٹ حلق میں اتارنا چاہتا ہے۔

بوائے۔ اسکیوز می ماسٹر۔

افضل۔ گو آن برنگ اِٹ۔

بوائے۔ فل آور ہاف۔

افضل۔ فل یو فول فل۔

بوائے۔ آل رائٹ سر۔

افضل۔ اونہہ قسمت میری دولت پر فنکر۔ میری تندرستی۔ اور یہ تین ٹکے کا نفر میری آزادی چھینا چاہتا ہے۔ ٹھیرو۔ تمہیں مجھ پر فتح پانے کے لئے زبردست جنگ کرنی ہوگی۔

بوائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ماسٹر کا بھیجہ وسکی میں بہہ گیا۔ دماغ کی جگہ کھوپڑی میں بھوسہ ہی بھوسہ رہ گیا۔

(تحسین کے ساتھ افضل کی بیوی پروین کا آنا اور الگ جگہ میں چھپ جانا)

تحسین۔ کیسا شخص اور کس حالت میں؟

پروین ۔ خداوندا کیا یہ آنکھیں یہی نظارہ دیکھنے کے لئے دی تھیں ۔

تحسین ۔ میں آگے بڑھتا ہوں۔ تم کو جب تک ظاہر ہونے کی ضرورت محسوس نہ ہو صبر کے ساتھ یہیں ٹھیرو۔

افضل ۔ کون ؟

تحسین ۔ نمک خوار۔

افضل ۔ تم ایک مرتبہ آئے ۔ میں نے تمہاری منّت کی ۔ دوسری بار آئے ۔ غصّہ کیا۔ تیسری دفعہ آئے ۔ دھتکار دیا ۔ اب چوتھی دفعہ مجھے بیزار کرنے کے لئے آئے ہو کیا میرا متواتر انکار تمہاری بوڑھی ٹانگوں کو تھکانے کے لئے کافی نہیں تھا۔

تحسین ۔ ولی نعمت ! ایک وفادار کتّا جب دھتکارے جانے پر اپنے مالک کیطرف محبّت سے دوڑتا ہے اور قدموں پر سر رکھ کر جس بوٹ کی ٹھوکر کھائی تھی۔ اُسی بوٹ کو چومتا ہے ۔ تو یہ بوڑھا غلام جس کی نصف جوانی اور نصف بڑھاپا آپ کے دسترخوان سے گرے ہوئے ٹکڑوں کے چننے میں گذرا ہے ۔ آپ کے بگڑنے اور خفا ہونے اور دھتکارنے سے کیونکر اپنا فرض بھول سکتا ہے ۔

افضل ۔ جب میں اپنا منشا ظاہر کر چکا ۔ تو پھر کیا چاہتے ہو مجھے کیوں ستاتے ہو۔

تحسین ۔ بہت زیادہ نہیں صرف اِتنا کہ جس طرح ایک شخص خوفناک خواب دیکھ کر چونک اُٹھتا ہے ۔ اُسی طرح آپ بھی اپنی موجودہ مسند سے جاگ اُٹھیے۔ روتی ہوئی بیوی کے آنسو پونچھئے ۔ بلکتی بچّی کو گود میں لیجئے ۔ اور آئندہ سے محبتی شوہر ۔ مہربان باپ اور ایک سمجھدار آدمی کی زندگی شروع کیجئے ۔

اچھا بُرا بنانا موقوف عقل پر ہے
تقدیر کے محل کا معمار خود بشر ہے
ٹھوکر سے بچکے چلئے فکرِ مآل کیجے
ماضی کے تجربے سے اصلاحِ حال کیجے

افضل - تم چاہتے ہو۔ کہ مَیں گھر چلوں۔ مگر پہلے یہ بتاؤ۔ کہ میرا گھر اب کہاں ہے؟ نہیں میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ مَیں نے گھر کی رونق۔ گھر کی دولت۔ گھر کی ہر اطمینان بخش زندگی۔ سب کچھ شراب اور جُوئے میں غارت کردی۔ اب گھر کی جگہ صرف مٹی اور پتھر سے بنی ہوئی چار دیواری ہے۔ جسکے اُوپر خوفناک مستقبل اپنے سیاہ پر کھولے ہوئے منڈلا رہا ہے۔ اور جس کے اندر ایک شریف بیوی اپنے بدچلن شوہر کے لئے ایک معصوم بچہ اپنے بدبخت باپ کے لئے رحم کے آنسو بہا رہا ہے۔ اپنے کردار پر پچھتا رہا ہے۔ ؎

ٹھکانہ اب کہیں آتا نہیں نظر مجھ کو
میں گھر کو بھول گیا اور میرا گھر مجھ کو
نہ ہو خراب تُم اِک خانمان خراب کے ساتھ
بس اب سے چھوڑ دو قسمت کے رحم پر مجھ کو

تحسین - ایسا نہ کہئے۔ جس طرح ہوا اور روشنی کے بغیر کوئی جاندار جی نہیں سکتا اُسی طرح آپ کے بغیر دونوں ماں بیٹی زندہ نہیں رہ سکتیں۔ ؎

بہت مشتاق ہے اپنے مسیحا کی زیارت کا
مداوا کیجئے گھر چل کے بیمارِ محبت کا

حواس و ہوش کی دشمن پریشانی نہ ہو جائے
میں ڈرتا ہوں کہیں وُہ غم سے دیوانی نہ ہو جائے

افضل۔ وُہ دیوانی نہ ہو جائے۔ نہیں وُہ پہلے سے دیوانی تھی۔ دیوانی نہ ہوتی تو آنکھیں ہو کر تاریکی پر روشنی کا دھوکا نہ کھاتی۔ اپنی قسمت اور اپنا ہاتھ ایک بدترین آدمی کے ہاتھ میں دے کر خود کو اور اپنی پسند کو ذلیل نہ بناتی۔ آہ تحسین! اُسے کس نے رائے دی۔ کہ مجھے قبول کرے۔ اُس نے کیا دیکھا جو مجھ سے شادی کی۔ اپنی بربادی کی۔ ؎

بھرے پڑے تھے جہاں بھر کے عیب سینے میں
ہزاروں داغ تھے اِس دل کے آب گینے میں
شراب خوار جواری ذلیل آوارہ
بتاؤ کون سی خُوبی تھی مجھ کمینے میں

تحسین۔ خُداوند نعمت! آپ کو پسند کرنا ہی اُس کے عقلمند ہونے کا ثبوت ہے۔ اُس نے خود کو آپ کی غلامی میں ہمیشہ کے لئے اسواسطے دے دیا کہ آپکے دِل میں محبت۔ آنکھوں میں مُروّت۔ ہاتھوں میں سخاوت۔ برتاؤ میں شرافت قول میں صداقت۔ غرض وُہ تمام خُوبیاں جن سے گوشت اور پوست کا مجموعہ شریف اِنسان کہلاتا ہے۔ پُورے جلال و جمال کے ساتھ موجود تھیں۔

افضل۔ مجھے بھی خیال آتا ہے۔ کہ شاید پہلے تھیں۔ مگر اب

تحسین۔ اب بھی ہیں۔ مگر آپ نے اِن سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ ؎

خار و خس پہ دامنے گلہائے خُوشبودار کے   زنگ آجانے سے جوہر دب گئے تلوار کے

افضل۔ آدھے شرابی اور آدھے پاگل کے سوا میں اب کچھ نہیں ہوں۔ اسلئے شرابی اور پاگل کے ساتھ اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

چھوڑو یہ مغز پاشی لاحل سمجھ کے مجھ کو
دفتر لپیٹو فرد مہمل سمجھ کے مجھ کو
حل ہی نہیں ہے جسکا وہ نکتہ ادق ہوں
میں اپنی زندگی کا بھولا ہوا سبق ہوں

(پروین آگے بڑھتی ہے)
پروین۔ رحم رحم میرے سرتاج رحم۔ ؎

ڈھونڈھتے ہیں اب مداوا سوزشِ غم کیلئے
کر رہے ہیں زخم دِل فریاد مرہم کیلئے
ہو چکی مشق ستم کم بخت پورا ہو چکا
بس نہ ٹھکراؤ کہ دِل کا کام پورا ہو چکا

افضل۔ پروین تم یہاں کیوں آئیں؟

پروین۔ لاچاری۔

افضل۔ کون لایا؟

پروین۔ دِل کی بیقراری۔

افضل۔ کیا تمہیں بھی یہاں کوئی داؤ لگانا تھا۔ قسمت آزمانا تھا۔

پروین۔ مجھے اپنی زندگی کے سرمائے کو جیت کرلے جانا تھا۔ ؎

کوئی آتا ہے زر لیکر کوئی لعل و گہر لیکر
میں آئی ہوں یہاں جانِ حزیں اور چشم تر لیکر

کہاں تک جیتی جائیگی قسمت خستہ جانوں سے
جو کھیلونگی اسکے ساتھ آج آنسو کے دانوں سے

افضل - پروین جس طرح شیطان جنت میں داخل ہونے کی جرأت نہیں رکھتا اُسی طرح میں بھی اس گھر کو جسے تیری عصمت اور نیکی نے مقدس بنا دیا ہے۔ اپنی نجس ہستی سے ناپاک نہیں کرسکتا۔ تمہارے متبرک دامن کو چھُوکر نجس نہیں کرسکتا۔

فغاں کا شور پیدا ہے شکستہ اُستخوانوں سے
پکڑ رکھا ہے بربادی نے مجھ کو دونوشانوں سے
نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ہے غم کے گھیرے میں
پڑا رہنے دے مجھ بدبخت کو میرے اندھیرے میں

پروین - میرے پیارے تمہاری افسوس اور ندامت سے بھری ہوئی تقریر مجھے اُمید دلاتی ہے۔ کہ تم نے اپنی غلطی جان لی ہے۔ اِس لئے مجھے اپنی اور تمہاری آئیندہ بہتری کے لئے ہر طرح کا اطمینان ہے۔ چلو گھر چلو۔ جب مرض کی تشخیص ہو گئی۔ تو علاج بالکل آسان ہے۔ ؎

ذرہ ذرہ بوئے اُلفت سے ختن بن جائیگا
مل کے جب بیٹھیں گے پھُولونکا چمن بن جائیگا
گھر نکھر جائیگا شکلیں سب پری ہو جائینگی
خشک کلیاں چار چھینٹوں میں ہری ہو جائینگی

افضل - پروین! انسان کے جسم کا کوئی حصہ جب سڑ جاتا ہے۔ تو اُسے کاٹ کر

پھینک دیتے ہیں۔ اس لئے اپنی سلامتی چاہتی ہے۔ تو مجھ ملعون سے نفرت کر۔
میں قریب آنا چاہتا ہوں تو مجھے ٹھوکر مار کر دُور پھینک۔ دیکھ اور اپنے
ساتھ انصاف کر۔ تو کیا تھی اور میں نے چند روز میں تجھے کیا بنا دیا جس
کے گھر میں دولت کے انبار۔ جس کے توشے خانوں میں ہزاروں نئے لباس۔
جس کے جسم پر لاکھوں کے زیور ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ایک شرابی
اور جواری نے اُسے کس کنگال حالت کو پہنچا دیا۔ تمہاری خوش قسمتی کو
بدبختی کے تاریک بادل کے نیچے چھپا دیا۔ ؎

تیری دولت کا ڈاکو ہوں تری راحت کا قاتل ہوں
کبھی عزت کے لائق تھا پر اب نفرت کے قابل ہوں
بہت بگڑی تیری حالت زیادہ نہ بگڑنے دے
مرے سائے سے بھاگ اور بلا پر اچھا داں نہ پڑنے دے

پروین۔ نہیں نہیں! مجھے دولت کپڑا زیور کچھ نہیں چاہیئے۔ میں صرف تمہیں
چاہتی ہوں۔ عورت کی دولت اسکی نیکیاں ہیں۔ عورت کا لباس اُس کی
عصمت ہے۔ عورت کا گہنا اُس کا شوہر ہے۔ ؎

زر و زیور گئے تو جائیں کس کا مال سارا تھا
میں خود ہی جب تمہاری ہوں تو جو کچھ تھا تمہارا تھا
میرا راحت محل پیارے تمہارے دل کا کونا ہے
میرے زیور فقط تم ہو۔ نہ چاندی ہے نہ سونا ہے

افضل۔ پروین میرے پاس جتنے لفظ تھے۔ انکار میں خرچ کر دیئے۔ اب

میرے پاس نہ لفظ ہیں۔ نہ وقت۔ اس لئے مجھے سمجھانے کی کوشش سے باز آؤ۔ بُوڑھے فرشتے اِسے ساتھ لو اور گھر جاؤ۔ مجھے نہ ستاؤ۔

تحسین ۔حضور اجازت دیں۔تو ایک جملہ۔

افضل ۔بس ایک حرف نہیں۔

تحسین ۔میری سُنئے۔

افضل ۔کان نہیں۔

پروین ۔کچھ دیکھو۔

افضل ۔آنکھیں نہیں۔

تحسین ۔سوچئے۔

افضل ۔دماغ نہیں۔

پروین ۔غور کرو۔

افضل ۔وقت نہیں۔

تحسین ۔خُدا کے لئے ہم پر ترس کھاؤ۔

افضل ۔شیطانوں۔چلے جاؤ۔ورنہ میں پاگل ہو جاؤنگا۔جب تک اِس سُنہری جُوتے سے قسمت کا سر کچل کر جو کچھ اُس نے مجھ سے اب تک چھینا ہے۔واپس نہ لُونگا۔کبھی گھر نہ آؤنگا۔

(چلے جانا)

پروین ۔تحسین! اب ہم کیا کریں۔کہاں تک سمجھائیں۔اپنی بگڑی ہوئی قسمت کو کیونکر بنائیں۔

تحسین۔ صبر اور دُعا
پروین۔ ۵

مُلتجی تھی کل جن سے اب وہ بر سرِ پیکار ہیں
وقت اور تقدیر دونوں درپئے آزار ہیں
رحم کرتا بیکسوں پر اے خُدا تو بھی نہیں
ابتو رونے کیلئے آنکھوں میں آنسو بھی نہیں

مُنشی نوبت رائے صاحب نظرؔ لکھنوی

تعارف

اُردو علم ادب کے رسالوں میں جو درجہ کبھی مخزن نے حاصل کیا تھا وہ قابلِ رشک تھا۔ لیکن انڈین پریس الہ آباد کا ادیب بلاشبہ اُس سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اور نہ صرف معنوی بلکہ ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے بھی لاجواب شے تھی۔ یہی رسالہ تھا۔ جو یورپ اور مصر کے مصوّر اور حسین رسالوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا تھا۔ اُس کے سب سے پہلے اڈیٹر مُنشی نوبت رائے صاحب ہی تھے۔ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے عہد میں اُسے جو عروج حاصل ہوا اُسے دُنیائے اردو برسوں تک فراموش نہ کر سکے گی۔ منشی صاحب نہ صرف زبردست ناظم ہیں۔ بلکہ عمدہ نثر نویس بھی ہیں۔ آجکل آپ اودھ اخبار لکھنؤ کے انچارج ہیں •

ابرِ بہار

جھومتی آتی ہے مغرب سے وہ اِک کالی گھٹا   رقص کرتی، راگ گاتی، منتشر زُلفِ رسا
سر سے لیکر پاؤں تک چھائی ہے متوالی ادا   دمبدم طغیانیِ مستی و شورِ نغمہ زا

بھر گئے ارگن ہوا میں ابر کی آواز سے
بزمِ عالم گونج اُٹھی نغمہ ہائے راز سے

دامنِ کہسار سے گذری ہے اٹھلاتی ہوئی — دخترِ دوشیزۂ دہقان کو للچاتی ہوئی
پیچھے پیچھے دوڑتی آتی ہے گھبراتی ہوئی — ہاتھ آجائے یہ دولت کسطرح جاتی ہوئی

لیجئے کیونکر اسے بڑھ کر کنارِ شوق میں
ہائے کیا ننھا سا دل ہے کس فشارِ شوق میں

بجلیاں دامن میں ہیں شوخی میں اپنی بے نظیر — بنگئی بڑھ کر نقاب عارضِ مہرِ منیر
جب افق پر جاکے چمکی باادائے دلپذیر — کھینچدی چمکا کے بجلی ایک سونے کی لکیر

ڈر گئے معشوق جب چمکی یہ بجلی زور سے
ہل گئے سینوں میں دل اسکی کڑک کے شور سے

ہوگیا بیدار عالم آگئی فصلِ بہار — پڑگئے باغوں میں جھولے گا رہے ہیں سب ملار
کھل گئے گلہائے رنگین لہلہائے سبزہ زار — کوئلوں کی کوک نے ڈالی ہے دنیا میں پکار

بلبلوں کے چہچہوں سے بوستاں پرشور ہے
میکشوں کے جمگھٹوں سے اک جہاں پرشور ہے

لیکے بربط نکلی ہے سلمیٰ بھی اپنی قبر سے — باہر آئی جھوم کر لیلیٰ بھی اپنی قبر سے
نکلے ہیں جمشید بھی دارا بھی اپنی قبر سے — اور سکندر سا جہاں پیما بھی اپنی قبر سے

اٹھ کے بیٹھا ہے جہانگیر شہِ رنگین مزاج
بزمِ کہنہ از سرِ نو منعقد ہوتی ہے آج

جامِ جم نکلے زمین سے بعد مدت اے مغان — انجمن کی دھوم ہوجائے میانِ دوجہان
اہتمامِ بزم اے ساقی ہو باصد عزم و شان — کان میں آئے نہ اب رندوں کی فریاد و فغان

بزم میں شاہنشہانِ ہفت کشور آئیں گے

نازنینانِ پری وش حور پیکر آئیں گے

جلوہ گر ہوں ایک جانب آج محمود و ایاز بعدِ مدت کچھ کھلے کیفیتِ راز و نیاز
ہو نہ کچھ شاہ و گدا میں آج فرق و امتیاز ابرِ رحمت سر پر چھایا ہے درِ جنت ہے باز
جامِ زریں ہیں لبالب بادۂ گلرنگ سے
گونج اٹھی بزم آوازِ رباب و چنگ سے

مستیاں پیدا ہیں گلشن کے دَر و دیوار سے لغزشِ پا کا مزا پوچھے کوئی مے خوار سے
ٹپکی پڑتی ہے جوانی پھول کی ہر خار سے اِک سماں ہے نغمہ ہائے عندلیبِ زار سے
سازِ ہستی بج رہا ہے ابر کی رفتار پر
دوڑتے ہیں نغمۂ دلکش ہوا کے تار پر

ابر میں مہ ہے چراغِ زیرِ داماں کی طرح دھیمی دھیمی روشنی ہے داغِ پنہاں کی طرح
جلوہ گر پردے میں ہے شمعِ شبستاں کیطرح چاہ میں بیٹھا ہو چھپ کر ماہِ کنعاں کی طرح
جھانک لیتا ہے جو یہ پردہ اُٹھا کر دُور سے
دفعتہً معمور ہو جاتی ہے دُنیا نُور سے

آسمان پر ابر اندھیری رات میں چھایا ہُوا چاند کا چھپنا۔ نکلنا دِل کو دیتا ہے مزا
ٹھنڈی ٹھنڈی چار جانب سنسناتی ہے ہَوا دُور تک جاتی ہے سناٹے میں نغموں کی صدا
اپنے اپنے رنگ میں سب اہلِ محفل مست ہیں
شاخِ گل پر بہکے گل میں عنادل مست ہیں

آج اے دل امتیازِ دین و ملت کفر ہے جسمیں ہو تفریقِ انسان وہ شریعت کفر ہے
ناصحِ مشفق کی ایسے میں نصیحت کفر ہے شرع کی رُو سے بھی ہمسایوں میں نفرت کفر ہے

یکدلی کا دَور ہو ہندو مسلمان ایک ہوں
متحد اغراض ہوں اجزائے ایمان ایک ہوں

سیتا جی

تھیں دیویاں ہماری عفت مآب یکسر — پڑھتیں نماز حُوریں دامن پہ جن کے آکر
جنّت تھی جن کو ہر دم زیرِ قدومِ شوہر — وہ ہو فقیر کوئی یا شاہِ ہفت کشور
یہ سب انتیں اُسی کو یہ مانتیں اُسی کو
اپنا خدائے عالم گردانتیں اُسی کو

اِن دیویوں میں سیتا سرمایۂ وفا تھیں — جو رامچندر جی کی بانوئے خوش ادا تھیں
شمعِ حریمِ دِل تھیں خورشید پُر ضیا تھیں — باطن میں ایک تھیں وہ ظاہر میں گو جُدا تھیں
کاشانۂ جہاں میں تھے رام شعلۂ نور
نورِ ازل کی خاطر سیتا تھیں شمع کا فور

دونوں کی ذات سے تھی دونو جہاں کی رونق — یہ تھیں زمیں کی رونق وہ آسماں کی رونق
دونوں کے دم سے دونی تھی اُس مکاں کی رونق — جس طرح بلبل و گل ہیں بوستاں کی رونق
دونوں ہی الغرض تھے چشم و چراغِ عالم
فیضِ قدم سے جنکے جنّت تھا باغِ عالم

سیتا کے عیش میں جب رخنہ فلک نے ڈالا — اور رام کو محل سے بن باس کو نکالا
رخصت ہُوا نظر سے گھر کا وہ سب اُجالا — دیدے کے اُن کو تسکیں سب نے بہت سنبھالا

سائے کی طرح لیکن دُنبالِ رام تھیں وُہ
شامِ شبِ الم میں ماہِ تمام تھیں وُہ

چھالوں کی خونفشانی کوسوں وُہ دشتِ پُرخار　　زخمی تھے پائے نازک چلنا تھا سخت دشوار
شوہر کے ساتھ لیکن وُہ دشت بھی تھا گلزار　　راحت سے اُسکی مطلب مرتے تھا سروکار
چہرہ تھا زرد لیکن دل میں شگفتگی تھی
ہر دم تھیں پیش شوہر اسکی بڑی خوشی تھی

صحرا میں رام و لچھمن پھرتے تھے بادلِ شاد　　سیتا تھیں ساتھ خوش خوش آتی نہ گھر کی تھی یاد
بستی سے موڑ کر منہ جنگل کیا تھا آباد　　بن باس کی غرض تھی چودہ برس کی میعاد
نیکی سے اُنکے ممنوں بن بھی تھے اور بشر بھی
مانوس ہوگئے تھے جنگل کے جانور بھی

راون نے دیکے دھوکا جب رام سے چھڑایا　　صحرا میں چار جانب سیتا کا رنج چھایا
جنگل کو چھان ڈالا لیکن پتہ نہ پایا　　پائی نہ گرد اُن کی۔ دیکھا نہ اُن کا سایا
لچھمن اُنہیں اکیلا یوں چھوڑ کر گئے تھے
بھائی کی جوشِ خوں سے لینے خبر گئے تھے

اے ساکنانِ صحرا سیتا کدھر گئی ہیں　　اے کوہ و دشت و دریا سیتا کدھر گئی ہیں
اے آہوانِ رعنا سیتا کدھر گئی ہیں　　کچھ دو نشان خدا را سیتا کدھر گئی ہیں
ہوتی ہے شام ابتک اُن کا پتا نہیں ہے
منزل سے دُور جانا اسدم روا نہیں ہے

کیا جانے کیا مصیبت گذری ہو اس حسیں پر　　صدمہ بہت ہے اسدم میرے دلِ حزیں پر

زیور پڑا ہوا ہے سب تا کا سعد بن میں پر　　آنسو کے بھی نشاں ہیں ظاہر کہیں کہیں پر

دل کو نہیں ہے دم بھر تابِ غمِ جدائی
ہر وقت کس سے ہوگا یہ ماتمِ جدائی

تیر و کماں تو لاؤ دیکھوں کہاں ہیں سیتا　　کس پردۂ خفا میں آخر نہاں ہیں سیتا
حالت ہے زار اُن کی یا شاد ماں ہیں سیتا　　دل کو میرے یقیں ہے محوِ فغاں ہیں سیتا

دنیا ہے اِس جہاں سے اے آسماں بتا دے
تیری نظر میں سب ہے سیتا کا کچھ پتا دے

کرتے ہوئے یہ زاری جاتے ہیں رام بن میں　　بلبل ہو جیسے نالاں بھولے پھلے چمن میں
لچھمن انہیں غربت ہمدرد ہیں محن میں　　ہوتی ہے اُن سے تسکیں اس رنج اس گھن میں

بھائی ملے تو ایسا۔ ہمدم ملے تو ایسا
زخمِ جگر کی خاطر مرہم ملے تو ایسا

یاں دل کو رام کے تھی ایذا و بے قراری　　سیتا پہ روتے روتے غش اِسطرف تھا طاری
تھی رہ نوردِ لنکا اُن کی ابھی سواری　　راون کی بھی خوشی تھی اسوقت اعتباری

پہنچیں میانِ لنکا جس دم وہ بے بسی سے
اک باغ میں اتارا راون نے خامشی سے

زیرِ درخت روئیں جی کھول کر وہ یک چند　　سیلابِ چشم اُمڈا پلکوں کا توڑ کر بند
اُس دل پہ بارِ غم ہے کل تک تھا جو خورسند　　روتی تھیں چپکے چپکے شمعِ سحر کے مانند

پابندِ شرم تھیں وہ نفرت رہی فغاں سے
گھٹ گھٹ کے جان کھوتیں کہتیں نہ کچھ زباں سے

راون تھا دیو سرکش لیکن فہیم و دانا ازبر تھے وید چاروں عالم وہ بے بدل تھا
آ کر حضور سیتا اظہارِ شوق کرتا لالچ ہر اک طرح کے دیتا تھا بے محابا
گستاخیوں سے لیکن مطلب نہ کچھ وہاں تھا
رازِ نجات اسکا اس سفر میں نہاں تھا

انساں کوئی جہاں میں اس کا نہ تھا مقابل تھی یوگ کی بدولت عمرِ دوام حاصل
اس زعم میں ہوا تھا ظلم و ستم پہ مائل نالاں تھی اس سے خلقت لرزاں تھے خوف سے دل
قاتل کوئی نہ اسکا اوتار کے سوا تھا
پرخاشِ رام سے بس اسکا یہ مدعا تھا

آخر کو بعد مدت جسدم خبر یہ پائی فوراً ہی سوئے لنکا کی رام نے چڑھائی
دل سے لگی ہوئی تھی سیتا کو دیں ہائی فوجیں ہوئیں اکٹھا بدلی سی ایک چھائی
بپھرے ہوئے بہادر شیر ژیاں کی صورت
لشکر ہوا روانہ ابرِ رواں کی صورت

راون بھی لیکے نکلا دیوانِ کوہ پیکر اڑ کر زمین سے پہونچی گردوں پہ گردِ لشکر
ہیبت سے اسکی کانپے دنیا کے بحر اور بر تیغیں کھچی ہوئی تھیں نکلے ہوئے تھے خنجر
لڑنے پہ کشمکش سب بڈھب تلے ہوئے تھے
نقارے بج رہے تھے پرچم کھلے ہوئے تھے

آخر کو فوج راون میداں میں کام آئی پھر بھی بہادری سے اس نے شکست کھائی
مشکل تھی موت اسکی لیکن اماں نہ پائی سیتا کو قیدِ غم سے فوراً ملی رہائی
زنداں سے چھٹ کے آئیں جسدم وہ جانِ عصمت

لازم ہُوا کہ پہلے دیں امتحانِ عصمت

دیکھا جو سمت شوہر پایا کبیدہ خاطر
اگلی سی وُہ محبت چہرے سے تھی نہ ظاہر

تھیں مزاجداں تھیں اَور رازِ دل سے ماہر
سمجھیں کہ بدگمانی لائی ہے رنگ آخر

عورت کی زندگی کیا شوہر جو بدگماں ہو
کہنے لگیں کہ فوراً اِس شک کا اِمتحاں ہو

داخل ہوئیں چتا میں آخر وُہ بے محابا
شعلوں سے آگ کے تھا آتشکدہ وُہ صحرا

اِس طرح آگ میں تھا روشن وُہ روئے زیبا
خورشید ہو افق میں جس طرح عالم آرا

گردوں سے ہو رہی تھی دیوی پہ بارشِ گُل
ہر لب پہ مدحِ سیتا ہر سمت تھا یہی غُل

جب آگ سے ہُوا کچھ اِن کا نہ بال بیکا
پہونچا ثبوت کامل جب پاکدامنی کا

تب رام نے بھی بڑھ کر ان کو گلے لگایا
عظمت ہوئی مسلّم آنکھوں پہ سب نے دی جا

لنکا کو فتح کرکے رام آئے جب وطن میں
آئی بہار رفتہ اُجڑے ہوئے چمن میں

نوجیں بھی ہمعناں تھیں منصور اور مظفر
مُدت سے منتظر تھا تختِ شہی و افسر

آخر کو تاجپوشی کا دن ہُوا مقرر
بجتے تھے شادیانے فرطِ خوشی سے گھر گھر

تیاریاں ہزاروں دربارِ عام میں تھیں
سیتا بھی جلوہ آرا پہلوئے رام میں تھیں

وفاتِ مادر

درد اُٹھا تھا نہ ایسا قلبِ شیدا میں کبھی
یہ ہجومِ غم ہُوا ہم پر نہ دُنیا میں کبھی

اشک خُونی بارہا آنکھوں سے ٹپکے تھے مگر
اِسقدر سُرخی نہ تھی خونِ تمنّا میں کبھی

اپنے گھر میں آج ویرانی جو آتی ہے نظر
ہُوگا عالم یہ نہ ہوگا وسعتِ صحرا میں کبھی

خُشک ہوتا ہے وُہ دریائے محبت آہ آہ
جسکی طغیانی رُکی دم بھر نہ دُنیا میں کبھی

سَر سے سایہ باپ کا اُٹھے ہوئی مدت مگر
تھا نہ یہ دردِ یتیمی قلبِ شیدا میں کبھی

پھر مادر نے لیا دِل ہاتھ میں کچھ اسطرح
ایک آنسو تک نہ تھا چشمِ تمنّا میں کبھی

زندگی ہنستے ہی گذری خوش رہے ہر وقت ہم
دِل نہ تھا اندیشۂ دُنیا و عقبےٰ میں کبھی

صُبح ہوتی تھی کہیں اور شام ہوتی تھی کہیں
بزمِ عشرت میں کبھی سیر و تماشا میں کبھی

ہوگیا آغوشِ مادر بھی جُدا آج اے نظر
اب نملیگی ایسی راحت پھر نہ دُنیا میں کبھی

منشی نادر علیخان صاحب نادر۔ کاکوروی مرحوم

تعارف

حضرت بیان ویزدانی میرٹھی کا نام جن شاگردوں نے روشن کیا ہے۔ اُن میں حضرت سرور کے بعد نادر کا درجہ ہے۔ اگرچہ آپ کا قلم تخیل کی اُن بلندیوں کو نہیں چھوتا۔ جہاں حضرت سرور معمولاً پرواز کیا کرتے تھے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں۔ کہ طرز تحریر دیکھ کر فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ دونو ایک ہی سرزمین کے شجر اور ایک ہی چمن کے پھول ہیں کلام نادر اُٹھا کر دیکھا جائے تو وہی سادگی نظر آتی ہے۔ وہی سوز وہی اثر۔ وہی تڑپ۔ روانی کا یہ عالم ہے کہ گویا کوئی مچھلی ہے جو پانی میں جدھر چاہتی ہے۔ تیرتی پھرتی ہے۔ آپ نے اپنے پیچھے نظموں کی جو یادگار بے بہا چھوڑی ہے۔ اُس میں سے ذیل کا انتخاب ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

اِس نظم کا اصل قصّہ یہ ہے۔ کہ کشمیر میں جہانگیر بادشاہ نے "دعوت گل" کے نام سے ایک میلہ کیا جسمیں نور محل کے ایک گستاخانہ نیلے پر برہم ہو کر اُسے شہر بدر کر دیا۔ تمام رات نور محل نے جنگل میں کاٹی اور دوسرے دن

جنگل کے جنوں سے مدد لیکر بہروپ بھر کر دعوتِ گل کے جلسے میں شریک ہوئی اور ایسی خوش ادائی سے ایک غزل گائی کہ جہانگیر بیخود ہو گیا جب اُس نے نورمحل کو پہچانا تو قصور معاف کر کے گلے لگا لیا۔

لو بجنے لگا وُہ ناچ کا ساز
آنے لگی پیاری پیاری آواز

طبلے کی گت گمک گمک وہ
گھنگھرو کی صدا چھنک چھنک وہ

سارنگی کی تان وُہ سُریلی
آواز وُہ گانے کی رسیلی

نور آئی ہے آسمان سے گانے
ٹھمری۔ ٹپّے۔ غزل۔ ترانے

جن میناروں پہ روشنی ہے
واں دیکھو عجیب دل لگی ہے

چڑھ کر کوئی مؤذن اُس پہ[1]
پڑھتا ہے کوئی چیز گا کر

کچھ عورتیں ہیں قریب یک جا
دیتی ہیں وُہ جواب اُس کا

سب مل کر ایک ساتھ گا کر
رہتا یہی مشغلہ ہے شب بھر

اور آگے بڑھ کے آؤ دیکھیں
کیسا ہے یہاں جماؤ دیکھیں

آوازیں یہ کیسی آ رہی ہیں
ٹھٹھے کی ہنسی کی آ رہی ہیں

اُونچے اُونچے گڑے ہیں کھمبے
خوشرنگ رنگے ہوئے ہیں کھمبے

---

[1] کشمیر میں غالباً یہ کوئی رسم ہے کہ جلسوں اور میلوں میں میناروں پر مؤذن نعتیہ یا وحدانیت کے اشعار گاتے ہیں۔ اور باری باری عورتوں کا غول گا کر اس کا جواب دیتا ہے۔ سرٹامس مور نے اسی طرح نظم کیا ہے۔ اور نیچے نوٹ میں مسٹر رسل نے اس رسم کی تائید کی ہے۔

ریشم کی ڈوریاں بھی رنگین — اور سُوت کی رسّیاں بھی رنگین
تختے رنگین سبز اور لال — اور جھول رہے ہیں خور تمثال
کچھ بیٹھے تانیں لے رہے ہیں — دو ناز سے پینگ لے رہے ہیں
اُڑتی ہوئی ساریاں ہوا میں — پھولی ہوئی وہ شفق گھٹا میں
راجہ اِندر کے جمگھٹے ہیں — پریوں کے تخت اُڑ رہے ہیں
جاتے ہیں پینگ ٹہنیوں تک — نارنج کی اُونچی چوٹیوں تک
جھولوں سے لپک کے خوش پسر — نارنجیاں توڑتے ہیں بڑھ کر
اور عاشقوں کو دکھا رہے ہیں — للچا للچا کے کھا رہے ہیں
اور آگے بڑھو تو چھوٹے بچے — خیموں سے نکل نکل کے اپنے
سبزہ پہ پھدک رہے ہیں کیسے — پھولوں پہ لپک رہے ہیں کیسے
جھک جھک کے لپک لپک کے بڑھ کر — شاخوں میں لٹک کے اور چڑھ کر
دامن میں پھول بھر رہے ہیں — آنے والوں پہ مارتے ہیں
ماماؤں پہ اور دائیوں پہ — ماں پر بہنوں پر اور بھائیوں پر
ہا ہا۔ ہوہو۔ مچا رہے ہیں — خود ہنستے ہیں اور ہنسا رہے ہیں
تالاب میں بھی ہے بج رہا ساز — لہروں اور کشتیوں کی آواز
موجوں کے وہ تھپیڑے چپ چپ — ہتّھوں کی وہ صدائیں ہپ ہپ
وہ تیز ہوا کی سنسناہٹ — اور جھینگروں کی وہ جھنجھناہٹ
لہروں کی ٹکّروں کی آواز — گرتے ہوئے پتھروں کی آواز
سب مل کر ایسی آ رہی ہیں — گویا کوئی راگ گا رہی ہیں

آوازیں یہ اُن کے زیر و بم کی　　تعلیم میں مین ٹھیک تال و سم کی

اِن سب میں ہے پہ اثر وُہ آواز　　ہو عشق کا جس میں سوز اُور ساز

آہیں دِلِ تفتہ عاشقوں کی　　اور سِسکیاں دِل جلے ہوؤں کی

جو دِل سے نکلے دِل میں چھپ جائیں　　معشوقوں کے جو کلیجے برمائیں

تڑپائیں ۔ رجھائیں ۔ گدگدائیں　　اُور یار کو جا کے کھینچ لائیں

مطلب کی بات ہو تو ہے بات　　اُور یہ نہیں تو وُہ ہے خرافات

آواز جو ہو اثر سے خالی　　اِک کیسہ زر ہے زر سے خالی

نغمہ ہو کہ آہ سرد کچھ ہو　　آواز ہے جب کہ درد کچھ ہو

مقبول ہے شاعروں کی آواز　　ہے سوز بھی اُسمیں اُور بھی ساز

نغمہ بھی آہِ سرد بھی ہے　　دِل کا شکوہ دِل کا درد بھی ہے

عالم کان اپنے ہے لگائے　　اِک بار وُہی صدا پھر آئے

جو بات زبان سے نکل جائے　　ممکن نہیں بے اثر وُہ ٹل جائے

معشوق ہزار جی چُرائے　　آئے اور لاکھ بار آئے

اِس زیست کا ماحصل یہی ہے　　دینا اُور اُس کا پھل یہی ہے

سعیِ انسان یہ ہے سرے سے　　کٹ جائے یہ زندگی مزے سے

ہو چاندنی رات میں لبِ جو　　پہلو میں اپنے اپنا مہرو

پھولوں سے چمن مہک رہے ہوں　　ساغر مے سے چھلک رہے ہوں

اور اوٹ کی آڑ میں مغنی　　ہریالے گا رہے ہوں یعنی

لُطفِ مے و لذتِ طرب ہو　　جب یہ سامانِ عیش سب ہو

پوری سب حسرتیں ہوں جی کی	کیا بات ہے ایسی زندگی کی
انسان کیا رات اور کیا دن	ہر وقت اسی فکر میں ہے لیکن
کون ایسے خوش نصیب ہیں آج	ساری ہندوستان کے سرتاج
سر حلقۂ مہوشان کشمیر	نور محل اور شہ جہانگیر
پھرتے ہیں چمن میں دوش بردوش	بیٹھے لب آب ہیں ہم آغوش
حاصل لطف مے و طرب ہے	معشوق بغل میں ہے تو ہے

عورت بیڑا اگر اٹھا لے
جنت کشمیر کو بنا لے

سوز پروانہ

سر میں پروانہ کے ہے اک شعلۂ جوش جنون	اسکے دل میں کیا ہے جلنے کیلئے اک قطرۂ خون
اسکی ہستی ہے متاع صد طلسمات فسون	پھونکدی خرمن یہ وہ خس ریزہ ہے آتش درون

اسکے بال و پر ہیں مثل شمع جلنے کے لئے
اور کلیجہ اس کا شعلوں پر پگھلنے کے لئے

شعلہ زن ہے اسکے دل میں لعنت پنہانکی آگ	اور ہے اس آگ کو اس قالب خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اسکی دولہن کا سہاگ	جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ

عشق جل بجھتا ہے خود سارا زمانہ پھونککر
خاک ہو جاتی ہے بلبل آشیانہ پھونککر

بھُولنا اپنے کو صُورت ہے کسی کے یاد کی — یعنی یہ معراج بھی ایک شکل ہے اُفتاد کی

حسنِ شیریں کا فسانہ موت ہے فرہاد کی — ہے خوشی منت کشِ غم عالمِ ایجاد کی

نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ صبحِ بہار
وسعتِ آغوشِ گُل ہے روحِ بلبل کا فشار

زیست کا کیا تذکرہ پروانہ اس سے سادہ ہے — موت کا عاشق ہی ہر دم مرگ کا دلدادہ ہے

مرنے کو یوں ہی کمر باندھے ہوئے ایستادہ ہے — المدد اے آرزوئے مرگ وہ آمادہ ہے

ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن اسکے لئے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن اسکے لئے

نادر آخر تا کجا یہ صدمۂ سوزِ نہاں — بس کہیں جل بجھ چکے بھی میرا جسمِ ناتواں

سوزِ حسرت سے میرے دل سے نکلتا ہے دھُواں — ہر نفس میرا صدائے صاف دیتا ہے کہ ہاں

پھونک دے اے عشق تو اِس ہستیِ خاشاک کو
اور اُڑا دے ہاتھ اُٹھا کر میری مشتِ خاک کو

ڈھونڈھتی ہے روحِ مضطر میری پروانہ فراغ — تنگیِ قیدِ قفس سے میرا دل ہے داغ داغ

جس طرح سے دُور تک پھیلائے نُور اپنا چراغ — جس طرح کوسوں تلک اُڑتی پھرے خوشبوئے باغ

سبزہ و گُل بنکے کاش اِس خاکدان پر پھیل جاؤں
رنگ بنکر میں فضائے آسمان پر پھیل جاؤں

پروانۂ جانسوز

شعلہ زن ہے میرے دل میں الفتِ پنہاں کی آگ ۔۔۔ اور ہے اس آگ کو اس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اس کی دولہن کا سہاگ ۔۔۔ بل بجھے جسطرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ

بجھ گیا دل میرا شمعِ دل فروزِ عشق سے
آشیانہ جل اٹھا بلبل کا سوزِ عشق سے

خلق کہتی ہے مجھے یہ ہوش سے بیگانہ ہے ۔۔۔ عقل سے خارج ہے یہ بیہودہ ہے دیوانہ ہے
جانتا ہے مجھ کو لیکن خوب جو فرزانہ ہے ۔۔۔ میری ہستی آہ عکسِ جلوۂ جانانہ ہے

رنگ چہرہ سے اڑا جب نکہتِ گل ہو گیا
دم جو نکلا نالۂ منقارِ بلبل ہو گیا

بھولنا اپنے کو صورت ہے کسی کی یاد کی ۔۔۔ یعنی یہ معراج بھی اک شکل ہے افتاد کی
حسنِ شیریں کا فسانہ موت ہے فرہاد کی ۔۔۔ ہے خوشی منت کشِ غم عالمِ ایجاد کی

نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ صبحِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے روحِ بلبل کا فشار

جسطرح اک قطرہ گرد اسکے محیطِ کشش بہات ۔۔۔ جسطرح ساغر میں جھلکے قطرۂ آبِ حیات
گرد میرے حلقہ زن ہے اسکی ساری کائنات ۔۔۔ عشق کیا ہے اک متاعِ کلیاتِ بے ثبات

قطرۂ پرجوش طوفان خیز می ریزد ز عشق
شعلۂ خاموش عالم سوز می خیزد ز عشق

میرے سر میں کیا ہے بس اک شعلۂ عشق و جنوں ۔۔۔ میرے دل میں کیا ہے جلنے کیلئے اک قطرۂ خوں

میری ہستی کیا ہے اِک برزخِ آتش درون میں اناالحق گو ہوں میں منصور ہوں میں نور ہوں
ننگ ہے محتاجیٔ گور و کفن میرے لئے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن میرے لئے
جسطرح سے دُور تک پھیلائے نُور اپنا چراغ جسطرح کوسوں تلک اُڑتی پھرے خوشبوئے باغ
تنگیٔ قیدِ قفس سے دِل ہے میرا داغ داغ ڈھونڈھتی ہے میری مضطر رُوح پروازِ فراغ
سبزہ و گُل بنکے کاش اِس خاکدان پر پھیل جاؤں
رنگ بنکر میں فضائے آسماں پر پھیل جاؤں

گھنٹہ نہیں بجیگا

انگلستان میں آزادی حکومت کے بانی مبانی آلیور کرامول کے زمانہ میں ایک نوجوان سپاہی پر کسی قصور کی وجہ سے پھانسی کا حُکم صادر ہُوا۔ حکمنامہ کے الفاظ یہ تھے۔ "جب گرجا گھر کا رات کا گھنٹہ بجے۔ ٹھیک اُسوقت مُجرم کو پھانسی دیجائے"۔ یُوں تو ہر نوجوان کی موت عبرتناک ہوتی ہے۔ لیکن اس بدنصیب کی مَوت سخت تر عبرتناک تھی۔ کیونکہ اسی ہفتہ اِس کی شادی اُسکی معشوقہ سے ہونے والی تھی۔ عاشق کی جان بچانے کا کوئی دقیقہ معشوقہ نے نہ اُٹھا رکھا۔ اُس نے ججوں سے گریہ و زاری کرنیکے بعد خود کرامول سے بھی عرض کی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ نا اُمیدی کے عالم میں اُس نے ایک تدبیر یہ سوچی کہ گھڑیالی کو گانٹھ کر گھنٹہ کا اُس رات بجنا ہی موقوف رکھے۔ لیکن اس کوشش میں بھی وُہ ناکام رہی۔ شام ہونے لگی۔ اور پھانسی دینے کی تیاریاں شروع

ہوگئیں۔ جلاد مجرم کو لیکر پھانسی کے پاس آموجود ہُوا۔ اَور منتظر تھا۔ کہ سوُرج غروب ہو اور گھنٹہ بجے۔ آخر کار گھنٹہ ہلا۔ اور اُس نے کوئی آواز نہ دی۔ تماشائی اور جلاد سب حیرت میں تھے۔ کہ کیوں گھنٹہ نہیں بجتا۔ صرف ایک شخص اِس راز سے واقف تھا۔ اور یہ وُہی نازنین تھی۔ جو یاس کے عالم میں دیوانہ وار گھنٹہ گھر کے پیچدار زینوں پر چڑھتی ہوئی اس خطرناک مقام پر پہنچ گئی تھی۔ اَور بھاری گھنٹہ کی زبان پکڑے ہوئے تھی۔ گھڑیالی نے رسہ پکڑ کے کھینچا اَور چھوڑ دیا۔ پھر زور سے کھینچا اور چھوڑ دیا۔ لیکن گھنٹہ صرف اِدھر اُدھر خاموشی کے ساتھ ہلتا رہا۔ اور اُس کے برنجی لبوں سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

بہادر نازنین کی حالت اس وقت نہایت مخدوش تھی۔ وُہ دو سو فٹ سے زیادہ بلندی پر گھنٹہ کا لٹکن پکڑے لٹک رہی تھی۔ اَور ہر جھونکے پر یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وُہ اُس کو کھڑکی سے باہر پھینک دیگا۔ آخر کار کہن سال گھڑیالی اپنی معمولی خدمت انجام دے کر چلا گیا۔ وُہ بوجہ کبر سنی کسی قدر اُونچا بھی سُنتا تھا۔ اَور اُس نے گھنٹہ کے غیر معمولی سکوت پر کچھ خیال نہ کیا۔ کرامول کچھ فاصلہ پر کھڑا یہ دیکھ رہا تھا اَور وُہ گھنٹہ کی اِس خلافِ معمول خاموشی کا سبب دریافت کرنے کے لئے بڈھے گھڑیالی کی طلبی میں چوبدار بھیجنے ہی کو تھا۔ کہ اُس کے پاؤں پر چند گھنٹہ قبل عرض و معروض کرنے والی نازنین دَوڑ کر گر پڑی۔ اَور اپنی بے اختیارانہ حرکت بیان کی۔ اپنی زخم کھائی ہوئی ہتھیلیاں اَور خُون چکاں اُنگلیاں دکھائیں جو رسہ کی رگڑ سے جا بجا کٹ گئی تھیں۔ کرامول کو اس پر رحم آیا۔ اُس نے اُس کی غیر معمولی جرأت کو دیکھ کر کہا کہ "جا۔ بہادر لڑکی تیرا عاشق زندہ رہیگا۔ اور آج گھنٹہ نہیں بجیگا۔"

(ذیل کی نظم میں اِسی واقعہ کا بیان ہے)

انگلینڈ کے پہاڑوں کی چوٹیوں میں چھپ کر — دِکھلا رہا تھا اپنی تنویر شاہ خاور
شامِ عروس سُوہا جوڑا بدل رہی تھی — پھُولی ہوئی شفق کا گلگونہ مل رہی تھی
سُورج جو کر رہا تھا روئے زمیں پہ غازہ — ہر شے میں پڑ رہی تھی گویا کہ جان تازہ

سب شادماں تھے لیکن دو نامرادِ اُلفت — رہ رہ کے دیکھتے تھے نظارہ یہ بحسرت
اِک ہونے والا دُولھا۔ اِک نازنین منگیتر — اِک ہونے والی بیوہ۔ اِک مرنیوالا شوہر
رات آتی یا اجل کا پیغام آ رہا تھا — سُورج کے ساتھ اُنکا دِل ڈُوبا جا رہا تھا
وُہ مستِ نیم جاں سا گردن جھکائے اپنی — یہ غم زدہ بھیانک صُورت بنائے اپنی
اُس پر تو حکم پھانسی کا ہو چکا تھا لیکن — بے موت مر رہی تھی یہ نازنین کم سن
دیوانہ وار کہتی نکلی سشن ججی سے — "گھنٹہ کو آج بجنا ہی چاہئے نہیں ہے"
"بجکر کسی پُر ارماں کی کیا وُہ جان لیگا" — "گھنٹہ نہیں بجے گا۔ گھنٹہ نہیں بجیگا"

یہ کہتی گھنٹہ گھر کو دوڑی گئی وُہ مضطر — اور دھم سے گر پڑی وُہ گھڑیالی کے قدم پر
پھر اُٹھ کے اور دو زانو ہو کر وُہ رو کے بولی — "او رحم کے فرشتے سُن ایک عرض میری"
دُور اک پُرانی سنگی تعمیر کو بتا کر — اور آہنی کٹہرے کی سمت ہاتھ اُٹھا کر
بولی کہ "قید ہے اُس زنداں میں ایک مجرم" — اور "دے چکا ہے اُسکو پھانسی کا حکم حاکم"
"جب آج شب کو خُونی گھنٹہ ترا بجیگا" — "پہلی صدا پہ اُسکی پھانسی پہ وُہ چڑھیگا"
"او نیک او مقدس گھڑیالی تو بچا دے" — "اِس نوجوان مجرم کو۔ اور مجھے جلا دے"

گھڑیالی نے یہ سُنکر کانوں پہ ہاتھ رکھا ۔ اور بولا "یہ تو بیٹی مجھ سے نہ ہو سکے گا"
"میری یہ عُمر آئی ہے گھنٹہ گھر سجاتے" ۔ اور آج بھی رہیگا گھنٹہ ضرور بج کے"
"کر دُوں میں عُمر بھر کی خاک اپنی نیکنامی" ۔ "مجھ سے کبھی نہ ہوگی ایسی نمک حرامی"
جب یہ خلافِ اُمید اُس نے جواب پایا ۔ مایُوسی کا اندھیرا آنکھوں میں اسکی چھایا
تنگیٔ وقت سے وُہ اس درجہ بوکھلائی ۔ کچھ اور اُس سے فوری تدبیر بن نہ آئی
اُس کے دماغ و سر میں وُہ حکم گونجتا تھا ۔ اور بار بار اُس کے کانوں میں کہہ رہا تھا
"پہلی صدا پہ گھنٹہ کی آج شب کو پھانسی" ۔ یہ حکم یاد آتے ہی وُہ زمیں سے اُٹھی"
اور دِل میں ٹھانکر اک منصوبہ بولی "اچھا ۔ یہ ہے تو آج کی شب گھنٹہ نہیں بجیگا"
"بانگِ درا پہ جب ہے موقوف جان اُسکی ۔ اِن ہاتھوں سے پکڑ لونگی میں زبان اُسکی"

اب رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا تھا ۔ جلاد پھانسی دینے مقتل میں آچکا تھا
اور سنگدل تماشائی منتظر کھڑے تھے ۔ کان اُنکے گھنٹہ گھر کے گھنٹہ پہ لگ رہے تھے
اُسوقت گھنٹہ گھر کی اندھیاری سیڑھیوں پر ۔ دیوار پکڑے پکڑے چڑھتی تھی ایک پیکر
کاہے کو کام ایسا اُس نے کبھی کیا تھا ۔ سینہ میں اُسکے ننھا سا دل دھڑک رہا تھا
آخر کو چڑھتے چڑھتے چوٹی پہ چڑھ گئی وُہ ۔ اور پاس اُس برنجی گھنٹہ کے بڑھ گئی وُہ
پھر سر اُٹھا کے اُس نے اُس کو بغور دیکھا ۔ لٹکن کا وزن دیکھا گھنٹہ کا دَور دیکھا
سمجھی کہ وُہ معین وقت اب قریب تر ہے ۔ اور دیر ایسے موقعہ پہ کرنا پُرخطر ہے
یہ جان لینے والا گھڑیال بج نہ اُٹھے ۔ یہ موت کا فرشتہ ناگاہ گرج نہ اُٹھے
اس خوف سے تڑپ کر اوپر اچک گئی وُہ ۔ اور گھنٹہ کا پکڑ کر لٹکن لٹک گئی وُہ

کتنی بلندی پر تھی لٹکی ہوئی وہ بندی؟ مینار کی بلندی اور کس قدر بلندی؟
جس جا نہ پہنچتا تھا آبادی کا دھواں تک دُنیا کا شور و غل بھی جاتا نہ تھا جہاں تک
آبادی کا چراغوں کی وجہ سے پتہ تھا اک بقعہ روشنی کا تھا نیچے شہر کیا تھا
نیچے چلی گئی تھیں جو سیڑھیاں مدوّر تھیں ٹھیک قعر دوزخ کا خوفناک منظر
دوزخ کا ڈر نہ مرنے کا خوف اُسکو مطلق ارض و سما کے مابین اک جسم تھا معلّق
گھڑیالی گھنٹہ گھر کے نیچے کھڑا ہُوا تھا رستہ کو پکڑے ٹائم پیس اپنی دیکھتا تھا
تھا منتظر کہ سُوئی جب ٹھیک نو بجادے تو گھنٹہ گھر کا رستہ وُہ زور سے ہلادے
موت اور نجات کا وُہ ناشاد منتظر تھا گھنٹے کی پہلی ٹن کا جلّاد منتظر تھا

اب وقت ٹھیک نو کا بتلایا سوئیوں نے اور اب کھڑے کئے کان آواز پر سبھوں نے
آہ! اب کھنچے گا رستہ اور اب ہلیگا گھنٹہ اب خوفناک اپنی آواز دے گا گھنٹہ
لو ہل رہا ہے۔ لیکن اُس پر صد آفریں۔ ہے آج اُس میں اُسکی خونی آواز ہی نہیں ہے
کیا بات ہے کسی نے جادُو نہ کر دیا ہو گھنٹہ کسی طرح بے قابُو نہ کر دیا ہو
گھڑیالی نے بقوت ہر چند اُسے جھنجھوڑا پھر کھینچا اور چھوڑا۔ پھر کھینچا اور چھوڑا
بُڈھے بجانے والے نے زور کم نہ مارا ہلتا رہا مگر اِس گھنٹہ نے دم نہ مارا

دور ایک ٹیکرے پر آکر ہُوا نمایاں جمہوریت کا بانی سرتاج انگلستاں
اور لگ گئیں نگاہیں سب کی کرامول پر کیا حکم دے وُہ دیکھیں گھنٹے کے اس خلل پر
اِکبار ہاتھ اُسنے خاموشی سے اُٹھایا اور لفظ بس کا لب پر وُہ حاکما نہ لایا

گھڑیالی رسہ رکھ کر ہٹ آیا گھنٹہ گھر سے
جسم معلق اُترا چپکے منار پر سے

اور گرتے پڑتے پہنچی خوش خوش وُہ اُس جیل پر
جاتے ہی گر پڑی وُہ پائے کرامول پر

سب سرگذشت اپنی رو رو کے کہہ سنائی
گھڑیالی کی خوشامد۔ مینار کی چڑھائی

لٹکن کو پکڑے گھنٹہ کے بیچ میں لٹکنا
آواز کی طرح سے گنبد میں سر پٹکنا

وُہ انگلیاں دکھائیں رسّے کی جو رگڑ سے
چھل چھل گئی تھیں بالکل کٹ کٹ گئی تھیں جڑ سے

جو چُومنے کے لائق پیاری ہتھیلیاں تھیں
وُہ آہ گہرے گہرے زخموں سے خوں چکاں تھیں

دیکھا کرامول نے یہ حال زار اُس کا
اَور رحم نے کیا دِل بے اختیار اُس کا

بولا کہ "جرم ثابت گو ہے ضرور اُس کا
لیکن معاف کرتے ہیں ہم قصور اُس کا

جا نیک بخت شوہر زندہ ترا رہے گا
اَور آج گھنٹہ گھر کا گھنٹہ نہیں بجے گا

سیّد غلام بھیک صاحب بی۔اے نیرنگ

تعارف

انبالہ میں وکالت کرتے ہیں۔ شاعری آپ کا فطری شُغل ہے۔ جو وکالت کی سنگلاخ زمین پر قدم زن ہوتے ہوئے بھی نہیں چھُوٹتا۔ جب مخزن نیا نیا نکلا تھا۔ اُسوقت ممدوح نے اپنے نام کی دُھوم مچا دی تھی۔ اِس کے بعد آپ نے اِدھر توجّہ نہیں دی۔ تاہم اب بھی جب کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں تو مہینوں اخبارات و رسائل نقل کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی نظموں میں خاص جدّت پائی جاتی ہے۔ وہ نہائت سادہ ہوتی ہیں۔ لیکن تاثیر میں سرشار بور۔

خوابِ یتیم

شفقتِ ہیئتِ اِنسان میں پھر آئی نظر
بن گیا پیکرِ محسوس خیالِ مادر

چار آنکھیں ہوئیں پھر پیار بھری آنکھوں سے
پھر محبّت نے لئے آکے جبیں کے بوسے

پھر وُہ آغوش کہ کہئے اُسے فردوسِ زمیں
وُہی آغوش مکاں اس کا بنا اور یہ مکیں

بیکسی ہٹ گئی اِک گوشۂ نسیاں میں دبک
دل سے جاتی رہی اندوہ کے کانٹے کی کھٹک

گھر رہی تھی اُن پیار کی نظروں کی چمک
عالمِ رُوح کی آئی تھی نظر اُن میں جھلک

پیار سے اسکی اُمنڈتی تھی خوشی وُہ دِل میں
کہ نہیں ملتی کہیں عالم آب و گل میں

آگئی جب کہ نظر شکل وہی جس کے لئے
سینکڑوں آہیں کھچیں اشک ہزاروں ہی بہے

کس میرسی کی لگا کرنے شکائیت اس سے
خستہ حالی کی لگا کہنے حکایت اس سے

ماں نے اُلفت سے بھرے لفظ تسلّی کے کہے
اُسکو سینے سے لگا پیار سے آنسو پُونچھے

بل بے نیرنگیٔ اُمید نہ آتی ہے نظر
اِسی عالم میں ذرا دُور پہ تصویرِ پدر

خواب ہے یا کہ حقیقت ہے یہ معلوم نہیں!
دِل کو اِس بخت کی بیداری کا ہو کیسے یقین!

چل گیا شک پہ بھی اُمید کا آخر افسوں
باپ سے جاکے لپٹ ہی گیا یہ ازار و زبوں

پھر ہُوا تجربۂ راحتِ آغوشِ پدر
رو کے لالنے لگا یُوں حرفِ شکائیت لب پر

تُم نے ابّا ہمیں مُدّت سے نہیں پیار کیا
نہ کھلونا کوئی بازار سے ہے لاکے دیا

گھر میں سب کہتے تھے تم جلدی ہی آجاؤ گے
اور شیرینی مرے واسطے تم لاؤ گے

تُم نہیں آئے یہ دن آگئے رستہ تکتے
چھُپ گئیں آنکھوں سے اماں بھی تمہارے پیچھے

سب چھپاتے رہے تُم دونوں کا جانا مجھ سے
کھیلتے کھیلتے کہدیتے تھے لیکن لڑکے

مر چکے ہیں ترے ماں باپ تجھے دھیان ہو کیا
یُوں ہی لوگوں کے تو کہنے سے نہ کھانا دھوکا

شک بھی تھا دِل میں مرے ساتھ ہی اُمید بھی تھی
اِس تذبذب میں بڑی سخت مُصیبت جھیلی

دیکھتا تھا میں جدھر سارا جہاں تھا ویراں
کوئی دُنیا میں نہ تھا حال کا میرے پُرساں"

باپ نے سینے سے لپٹا کے اُسے پیار کیا
اِک تر و تازہ اُسے خوشۂ انگور دیا

جُوں ہی لڑکے نے وُہ انگور زباں پر رکھے
ذائقہ آم کا انگور میں پایا اُس نے

خوابِ غفلت سے تحیّر نے جگایا شک کو — کہ یہ تصویر دلآویز کہیں خواب نہ ہو
شک کے آتے ہی دگرگوں لگی ہونے حالت — لُطفِ منظر سے لگا مانگنے فوراً رُخصت
باپ کے رُخ پہ نظر آئے تغیّر کے نشاں — ماں کی صُورت پہ گذرنے لگا دھوکے کا گماں
شک نے پامال کیا لُطفِ نظر ہائے غضب — خاک میں مِل گئے اُمّید کے منصوبے سب
شک نے حجّت یہ اُٹھائی کہ اِسے خواب کہے — زورِ اُمّید نے مارا کہ حقیقت سمجھے!
کشمکش سینے میں اُمید نے کچھ کی جو اِدھر — ہاتھ لپکا کے پکڑنے لگا دامانِ پدر
ماں کی تصویر جو تھی دُھندلی سی ہوتی جاتی — سعی کی دامِ تصوّر میں اُسے کھینچنے کی

بامِ مقصد پہ نہ پہنچی جو تصوّر کی کمند
ہو کے مایُوس لگا رونے بآوازِ بلند

اپنے ہی رونے کی آواز سے وُہ چونک اُٹھا — دِل پہ عالم تھا مگر اس کے عجب حیرت کا
نیست اَور ہست میں کچھ فرق نہ کر سکتا تھا — دل میں جذبات نے طُوفان اُٹھا رکھا تھا
بیدلی کا تھا یہ عالم کہ نہ اُمّید نہ یاس — اُس کے اِن لفظوں سے کر لیجیے حال اسکا قیاس
خواب تھا یا کہ حقیقت یہ پدر اَور مادر! — ماں کے کیا معنی ہیں؟ کس چیز کو کہتے ہیں پدر

کچھ کہے کوئی یقین مجھ کو نہیں آسکتا
کہ میں اس دہر میں ماں باپ کبھی رکھتا تھا

کسی کا دِھیان

اوّل میں اِمیں نثار ترے اے کسی کے دھیان — اِس رُوح کی تو رُوح ہے اِس جان کی ہے جان

تو جلوۂ نہاں ہے کسی کے جمال کا — اے سینکڑوں دلوں کی خوشی! تجھ پہ میں فدا

سُونا پڑا ہے دل کا شبستاں ترے بغیر — کیسے بسے یہ خانۂ ویراں ترے بغیر؟

ہے انتظار حسرتِ دیدار کو ترا — ارمان تک رہے ہیں تری راہ جلد آ

تو شمع ہے خیال کے فانوس کے لئے — روشن چراغِ فکر ہے تیرے ہی نُور سے

ذرّہ صفت ہے واہمہ تو مہرِ خاوری — اس کی فسوں گری ہے تری ذرّہ پروری

دیدارِ یار جامِ شرابِ طہُور ہے — تو اِس مئے لطیف کا پیارا سُرور ہے

دُوری تری جُدائی جاناں سے کم نہیں — تو ہو تو مجھ کو یار کی فرقت کا غم نہیں

اِس دل کا غم بھی تو ہی ہے اور غمگسار بھی — اِس کی تڑپ بھی تو ہی ہے اسکا قرار بھی

خلوت کا تو انیس ہے جلوت کا تو رفیق! — ہر حال میں تو ساتھ ہے اے باوفا شفیق!

کیا تجھ سے نوک جھوک ہے کیا چھیڑ چھاڑ ہے — ہے صُلح بھی تجھی سے تجھی سے بگاڑ ہے

ہاں تیرے رُوٹھنے میں منانے میں لُطف ہے — اس دل لگی میں ہنسنے ہنسانے میں لُطف ہے

اپنے لئے جہاں سے الگ اِک جہاں ہے تو — گلگشتِ شوق کے لئے باغِ جناں ہے تو

تو میری جان کے ہر رگ و پے میں ہے موجزن — تو مجھ پہ ہے محیط تو میں تجھ میں ہوں مگن

یہ سر خدا کرے نہ ہو جب سر میں تو نہ ہو
وُہ دن نہ ہو کہ دل میں تری آرزو نہ ہو

خار ۲۲

تو سمجھتا ہے کہ اِس باغ میں بیکار ہوں میں؟ — محض بیکار ہی کیا موجبِ آزار ہوں میں؟

تُو نے دیکھا ہے مجھے دیدۂ عبرت سے کبھی؟
قدر پُوچھی ہے مری اہلِ بصیرت سے کبھی؟

سلکِ ہستی میں کوئی شے کہیں بے سُود بھی ہے؟
جلوۂ حُسن کسی چیز میں محدود بھی ہے؟

کلکِ قدرت نے لکھی ہے کوئی شے بے مطلب؟
اِس مسدس میں کوئی لفظ بھی ہے بے مطلب؟

نورِ خورشید کا ہر ذرّے میں ہے راز چھپا
موجِ دریا کا ہے ہر قطرے میں انداز چھپا

ایک قانون کے تابع ہیں شجر ہو کہ حجر
ایک سانچے میں ڈھلے ہیں کُرۂ خاک و قمر؟

تو گل و خار میں کرتا ہے تمیزیں قایم
دیکھ اُس آئین کو جس سے ہیں یہ چیزیں قایم

کس جگہ حُسن کے آئین کا اظہار نہیں
گُل ہی گُل باغِ جہاں میں ہے کہیں خار نہیں

آہ کیا چشمِ مشاہد کی ہے کوتہ نظری!
جس سے مستور مِرے حُسن کی ہے جلوہ گری

دیکھئے حُسنِ تناسب کا نمونہ ہُوں میں!
کیا دلآویز ہُوں کیا شوخ رنگیلا ہُوں میں

ہے دِل افروز مِری نوکِ سناں کی سی چمک
میری تشبیہہ پہ اترائے حسینوں کی پلک

رنگ ہر شاخ پہ پاؤ گے نِرالا میرا
روپ ہر نخل پہ دیکھو گے انوکھا میرا

نگہِ حُسن طلب دیکھیے تو رعنا ہُوں میں
دِل میں ہر رنگ میں ہر رُوپ میں کُھبتا ہُوں میں

رونق افروز ہے گُل باغ میں زینت کے لئے
میں چمن زار میں ہُوں گُل کی حفاظت کے لئے

دامنِ اہلِ تطاول میں اٹک جاتا ہُوں
دیدۂ حاسدِ گلچیں میں کھٹک جاتا ہُوں

نہیں آزار دہی خلق کی شیوہ میرا
پھر بھی گلچیں کی مدارات ہے عُہدہ میرا

توڑ لینا گُلِ تر کا کوئی انسانی ہے؟
باغ میں یُوں ہی تباہی کی ہوا آنی ہے

گُل کو وُہ اپنی غرض کے لئے برباد کرے!
کیُوں نہ بندہ عملِ نشترِ فصّاد کرے؟

راہِ رَو سے نہیں صحرا میں کبھی مُجھ کو خلش
ہاں اگر بھائے اُسے آپ ہی غفلت کی روش

خُود ہی مجھ خاک نشیں کو وُہ کچُل ڈالے اگر
تو کبھی اُس کو بتاتا ہُوں سلامت کی ڈگر

سینکڑوں مور و ملخ وُہ تو کچل دیتا ہے
یُونہی چٹکی سی کبھی بندہ بھی لے لیتا ہے

اِس سے ہے نیند سے رہرو کو جگانا مقصود
قدر ہے خاک نشینوں کی بتانا مقصود

اِس سے کیا بڑھ کے کرُوں کام مَیں اِنسانوں کا
مَیں نگہبان ہُوں کھیتوں کا خیابانوں کا

یُوں مِری قدر کو جانے کہ نہ جانے کوئی
میرے احسان کو مانے کہ نہ مانے کوئی

خوابِ ناز

(ایک منظر کی یاد میں)

ہاں نگاہِ شوق آ دِکھلائیں اِک پیارا سماں
پاک نظارہ ہے۔ آ نا پاک دِل سی تو بھی یاں

تو بنے گلچیں تو یہ ہے۔ ایک طرفہ بوستاں
شائقِ گلگشت جس کا ہو دلِ رُوحانیاں

حُسن کا اِس دم عجب عالم فریب انداز ہے
وُہ بہارِ باغِ خُوبی محوِ خوابِ ناز ہے

اِس گھڑی آرام میں ہیں وُہ نظر کی بجلیاں
چلبلی وُہ مسکراہٹ وُہ پیارے شوخیاں

جاگتا ہے ایک بھولا پن مثالِ پاسباں
پیارے چہرے پر ہے چھایا ہائے کیا پیارا سماں

گر فرشتے بھی یہ بھولی صورت دیکھ پائیں
اپنے معصومی کے دعوے سے یقیں ہی ہاتھ اُٹھائیں

رُوح پر کرتا ہے یہ منظر عجب دلکش اثر
جس طرف کو آنکھ اُٹھاؤ چاندنی ہے جلوہ گر

منعکس ہوتا ہے اِس چہرے سے کیا نُورِ قمر
چاندنی کی ہر کرن ہے ایک اُلفت کی نظر

چاند بھی گویا کہ اِس جلوے سے محوِ دید ہے
ہاں مُبارک ہو نگاہِ شوق تیری عید ہے

ہے غرورِ حُسن کی اس سادگی میں بھی جھلک   ہر شعاعِ حُسن میں ہے برقِ خاطف کی چمک
نشترِ جاں ہے سکوں میں بھی ہر اک بانکی پلک   اضطراب افزا ہے گھونگر والے بالوں کی مہک

ابروئے پیوستہ میں عشوہ ہے گو دزدیدہ ہے
مُسکراہٹ ہے لبوں پر اب بھی گو خوابیدہ ہے

ہیں ہم آہنگِ خموشی غمزۂ و ناز و ادا   دیدۂ مشتاق ہے آئینہ ساں حیرت زدہ
اِس چمن کی دِلفریبی کی نہیں کچھ انتہا   اَے نگاہِ شوق بس گلگشت اس کی تا کجا

یہ نہ ہو ارمان کی بے تابیاں ہونے لگیں
جاگ اُٹھیں وُہ تو تجھ سے بدگماں ہونے لگیں!

سودائے خام

جو ہو مجھ سے پیار تُم کو۔ جو ہو تُم سے پیار مجھ کو   نظر آئے خارِ ہستی گُلِ نوبہار مجھ کو
یہ ضیائے مہرِ تاباں   یہی آنی جانی گھڑیاں
یہ فضا یہ سبز پودے   یہی گُل یہی پرندے
یہ کمالِ حُسن و زینت   مجھے دیں نویدِ راحت
میری زیست کا ترانہ   ہو سرودِ دِلبرانہ
نہ یہ بے سُری صدائیں کریں بیقرار مجھ کو   جو ہو مجھ سے پیار تُم کو جو ہو تُم سے پیار مجھ کو!

جو ہو مجھ سے پیار تم کو! مگر آہ! یہ کہاں ہو؟
کوئی انقلاب آئے تو وہ دن مجھے دکھائے
کہ ہو شاہ گدا کا ہمسر ہو زمیں پہ مہ خراماں
میری خوش نصیبیوں کا ہو ہر ایک زباں پہ چرچا
میرے عشق کی حکایت بنے دفترِ مسرّت
کرے مستِ عیش و عشرت مۓ دیدِ یار مجھ کو جو "ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو!"

جو "ہو تم سے پیار مجھ کو" میری عمر یوں بسر ہو
کروں عزق بحرِ نسیاں غمِ دہر و فکرِ ساماں
یہ مشقّتِ پشیماں یہ ہجوم یاس و حرماں
انہی قدموں میں پڑا ہوں تمہیں مسکراتے دیکھوں
مری زیست ہو محبّت کرمِ مغانِ اُلفت
مۓ بیخودی پلا کر کرے ہوشیار مجھ کو جو "ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو!"

جو "ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو مگر آہ! تم بتوں کا نہیں اعتبار مجھ کو"
یہ کہاں ہے اپنی قسمت کہ ہو مجھ سے تم کو اُلفت
تمہیں حسن و خود پرستی مجھے عشق و حال مستی
ملیں پھر جو ہم تو کیونکر؟ جئیں یوں ہی زندگی بھر!
دم واپسیں تک اے جاں رہیں دل کے دل میں ارماں!

پسِ مرگ بھی کھٹکتا یہ جگر میں خار جائے! لبِ گور بھی تڑپتا دلِ بے قرار جائے!

انسان کی فریاد

ہاں اے مصافِ ہستی! مت پوچھ مجھ سے کیا ہوں! اِک عرضۂ بلا ہوں! ایک لقمۂ فنا ہوں!
نے مجھ کو جائے ماندن نے مجھ کو پائے رفتن میں راندۂ قدر ہوں آوارۂ قضا ہوں!
مجبوریوں نے ڈالا گردن میں میری پھندا خوکردۂ وفا ہوں جاں دادۂ رضا ہوں
جو میری حاجتیں ہیں ساری مصیبتیں ہیں نکبت کی ابتدا ہوں شامت کی انتہا ہوں
صیادِ حادثے کا کرتا ہے میرا پیچھا مرغِ بریدہ پر ہوں صیدِ شکستہ پا ہوں
ہے ذات میری مجمع ساری برائیوں کا کہنے کو میں بڑا ہوں لیکن بہت بڑا ہوں
آزادیوں کی مجھ پر تہمت غلط سراسر میں قیدیٔ ہوس ہوں میں بندۂ ہوا ہوں
اِک بات ہو بتاؤں اِک درد ہو سناؤں روؤں بھلا کہاں تک کب تک پڑا کراہوں
فریاد کی اجازت مجھ کو نہ کوئی فرصت ظاہر ہمہ خموشی باطن ہمہ بکا ہوں

کمبخت دل کچھ ایسا میں ساتھ لیکے آیا اِک لمحہ جس کے ہاتھوں دنیا میں سکھ نہ پایا
جو جوش اس میں اٹھا حالات نے دبایا جو شعلہ اس میں بھڑکا تقدیر نے بجھایا
اُمّید کا یہ غنچہ کھلتے کبھی نہ دیکھا یہ آرزو کا پودا پھلتا نظر نہ آیا
دلسوزیِ خلائق سو بار اس میں اُمڈی ابرِ جنونِ اُلفت سو بار اس میں چھایا
عزمِ رہِ اخوّت ہر اک طرح سے ٹھانا فیاضیوں کا بیڑا سو سو طرح اٹھایا

گو اِس میں موجِ زن تھی قوم و وطن کی اُلفت	لیکن غرض نے اِسکو کچھ اَور ہی سکھایا
ہوتی نہیں رسائی اُمید کے اُفق تک	طولِ امل نے اِسکو اِک جال میں پھنسایا
جو آرزو ہے اِس کی ناکامیِ ابد ہے	ارمان اِسکا حرمانِ امید اِس کی مایا
پائی نہ دادِ اِس نے طاقت بقدرِ ہمت	بے اختیاریوں نے یہ روزِ بد دکھایا

کی رہبری خرد نے ہرچند رہنمائی	اِس جہد پر بھی لیکن کھلتی نہیں سچائی
پایا نہ میں نے ابتک مقصد کا اپنے ساحل	کی بحرِ معرفت میں دن رات آشنائی
اِس جستجو میں مَیں نے کی سَیرِ طور و ایمن	پربت کو گھر بنایا جنگل سے لو لگائی
مندر کو جاکے دیکھا گرجا میں جاکے ڈھونڈھا	مسجد کو چھان مارا اِسکی نہ دید پائی
جوگی کا رُوپ دھارا بن میں کیا گذارہ	تن پر بھبھوت مَل کر دُھونی بہت رمائی
جپ تپ میں عُمر اپنی کی مَیں نے تیر اکثر	بَن بَن کے پیر راہب جا خانقہ بسائی
صُوفی بھی بنکے دیکھا اَور رِند بھی رہا بھی	کر نعرۂ انا الحق اِک کھلبلی مچائی
پھرتی ہیں ماری ماری مشتاقِ جلوہ آنکھیں	پر ایک جھلک سے بڑھکر دیتا نہیں دکھائی
بے فائدہ ہے ساری یہ عقل کی تگاپو	تا منزلِ حقیقت ممنوع ہے رسائی

اُٹھ جا نظر سے میری ہاں اے حجابِ ہستی	حُسنِ ازل نہاں ہے زیرِ نقابِ ہستی
یہ زندگیِ اِنساں اِک خواب ہے پریشاں	بیداریِ عدم ہے تعبیرِ خوابِ ہستی

ل مایا فلسفہ ویدانت کی اصطلاح میں دھوکے اور سراب کے سے معنے رکھتا ہے۔ ۱۲

میں چاہتا ہوں ساقی نشۂ مے فنا کا
بیگانۂ خرد ہے مستِ شرابِ ہستی

طالب ہوں اب سکونِ دنیائے نیستی کا
یہ کشمکش کہاں تک اے اضطرابِ ہستی

دیکھیں اگر تو کیونکر ہم جلوۂ معارف
تو ظلمت نظر ہے اے آفتابِ ہستی

تسکین کو زہرِ قاتل آبِ ہوائے عالم
راحت کا دشمنِ جاں ہر انقلابِ ہستی

یہ میرے دل کی حالت یہ میری روح کی گت
کہلاؤں کس صفت پر میں انتخابِ ہستی

اے تشنۂ حقیقت دھوکے میں تو نہ آنا
ہر دام پر خطر ہے موجِ سرابِ ہستی

چاہے اگر رہائی پیش از فنا فنا ہو
پاداشِ جرمِ ہستی ہے یہ عذابِ ہستی

انجامِ محبت

(حرماں نصیب گلیٹ[۱] زبانِ حال سے)

مجھ سے پوچھے کوئی انجامِ محبت کے مزے
بادۂ حرماں کی لذت ۔ جامِ حسرت کے مزے

---

[۱] مغرب کے لاثانی فسانہ نگار وکٹر ہیوگو کے فسانہ ٹوائلرز آف دی سی کو ختم کرکے راقم کے دل میں ان خیالات نے خود بخود ہجوم کیا۔ گلیٹ ایک حسینہ پر عاشق ہے۔ اس حسینہ کے چچا کا جہاز کہیں دور سمندر میں ٹوٹ کر غرق ہوگیا ہے۔ یہ چچا ہی اس حسینہ کا سرپرست بلکہ بمنزلہ پدر ہے۔ وہ حسینہ اور اسکا چچا وعدہ کرتے ہیں کہ جو کوئی اس شکستہ جہاز کے انجن کو سمندر سے نکال لائے اس سے اس حسینہ کی شادی ہو۔ گلیٹ اس شرط کو منظور کرکے دو ماہ کی لاتعداد مصائب جھیل کر انجن کو تن تنہا نکال لاتا ہے۔ مگر اس اثناء میں وہ حسینہ اپنا دل ایک اور کو دے بیٹھی ہے۔ گلیٹ یہ دیکھ کر اپنے ہاتھ سے اپنے رقیب کی شادی اس حسینہ سے کرا کر خود سمندر میں ڈوب مرتا ہے۔ ۱۲

مجھ پہ احساں کر گئی وعدہ فراموشی تری
بیوفائی نے ہی دکھلائے شہادت کے مزے

کوہکن بھی داستاں کو میری سُنکر بول اُٹھے
کاہے کو چکھے تھے میں نے یہ مُصیبت کے مزے

گو سرابِ آرزو تھا تیرا پیمانِ وفا
پر ملے دھوکے میں بھی ہم کو حقیقت کے مزے

آہ اُمّیدِ حصُولِ مرہم مقصُود میں
لُوٹے ہیں کیا کیا مرے دل نے جراحت کے مزے

ذائقہ دردِ محبّت کا تن آسانوں کو کیا
جانتے ہیں اہلِ ہمت ہی مُصیبت کے مزے

بحرِ اُلفت میں تھا طُوفانِ شدائد کا خطر
سب بھلا دیتے تھے پر اُمّیدِ راحت کے مزے

بیوفا یارِ ستم پیشہ اگر نکلا تو کیا
کم نہیں راہِ وفا میں استقامت کے مزے

جامِ وصلت سے نہیں کم مجھ سے حرماں دوست کو
یہ خمارِ نشۂ صہبائے اُلفت کے مزے

بوالہوس کو ہی مُبارک وعدۂ اُلفت ترا
ہم اُٹھائینگے بس اب ایثار و غیرت کے مزے

جان دینگے اب تو قعرِ بحرِ ناکامی میں ہم
پائینگے گمنامیٔ مرقد میں شہرت کے مزے

چھُٹ گئے اُمید کے پھندوں سے اب نیرنگ ہم
یاس نے ہم کو دیئے عیش و مُسرت کے مزے

چوہدری خوشی محمد صاحب ناظر۔ بی۔ اے

تعارف

چوہدری خوشی محمد ناظر سیالکوٹ کے رہنے والے اور علیگڈھ کالج کے سرمایۂ افتخار گریجوایٹ ہیں۔ آج کل آپ ریاست کشمیر کی گورنری کے اعلےٰ منصب پر ممتاز ہیں۔ آپ کو پہلی بار آپ کی نظم جوگی و ناظر نے اُردو خوان پبلک سے رُوشناس کرایا تھا۔ آپ کا مرثیہ سرسید احمد خان مرحوم اُردو لٹریچر میں خاص حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم نے ایک مرتبہ اِس مرثیہ کی نسبت فرمایا تھا کہ سرسید کے جتنے مرثیے اُردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اُن سب پر چوہدری خوشی محمد کا مرثیہ ہر لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے۔ غیر معمولی خیالات کو معمولی زبان میں ادا کرنا آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ آپ کے بیشتر کلام میں خواجہ حالی کی طرزِ خاص کا نمایاں رنگ پایا جاتا ہے۔ آپ ڈاکٹر اقبال کے ہمعصر اور قبولیت کے لحاظ سے اُن کے برابر کے شریک ہیں۔ آپ کا کلام سرکاری مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ اور عوام و خواص میں وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اُردو شاعروں کیلئے جہاں یہ امر سرمایۂ ناز و افتخار ہے کہ اُن کا ایک ہم نوا ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست میں گورنری کے عہدۂ جلیلہ پر فائض ہے۔ وہاں اُردو زبان کے لئے یہ امر موجب افسوس ہے کہ آپ فرائض منصبی کے باعث اسکی طرف سے قطعی لاپرواہ ہوگئے اور وہ آپکے فیض سخن سے محروم ہوگئی۔

جوگی اور ناظر

کل صبح کے مطلع تاباں سے | جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے | خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی | جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی | ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی | ہر شاخِ نہالِ رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے | ہر سرو و سمن طنبور ہوا
سب طائر ملکر گانے لگے | عرفاں کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے | دِل کش وہ سماعِ طیور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی | اور بزمِ سرور سجائی تھی
بن میں گلشن میں آنگن میں | فرشِ سنجاب و سمور ہوا
تھا دِل کش منظر دشت و جبل | اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر | جا نکلا ناظرِ دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے | پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے | کوہر نے قنات لگائی تھی
یہاں برف کے تودے گلتے تھے | چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اگلتے تھے | نالوں نے دھوم مچائی تھی

یہاں قُلّۂ کوہ پہ رہتا تھا | اِک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کی | اور انگ بھبوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر | اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر | جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلقِ خُدا سے بیگانہ | وُہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ | آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں | اور جھک کر مَیں نے سلام کیا
تب آنکھ اُٹھا کر ناظرؔ سے | یوں بَن باسی نے کلام کیا!

کلامِ جوگی

کیوں بابا! ناحق جوگی کو | تم کس لئے آکے ستاتے ہو
مَیں پنکھ پکھیرو بَن باسی | تم جال میں آن پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا | کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا | تم ہم کو سُنانے آتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے | اِس نگری سے مُنہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے | تُم لاکے وُہی پہناتے ہو
تُم پُوجا کرتے ہو دھن کی | ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں مَن کی | تُم اِس کو آکے بجھاتے ہو
سنسار سے یہاں مُکھ پھیرا ہے | مَن میں ساجن کا ڈیرا ہے

یہاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے — تم کس سے آنکھ ملاتے ہو
اُس مست قلندر جوگی نے — جب ناظر کو یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے — پھر جوگی سے یہ خطاب کیا

خطابِ ناظر

ہیں ہم پردیسی سیلانی — مت ناحق طیش میں آ جوگی!
ہم آئے تھے تیرے درشن کو — چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں؟ — پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں؟
ہر محفل میں ہر منزل میں — ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں — سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں — ہر اُترا ہے ہر جا جوگی!
جی شہر میں خوب بہلتا ہے — وہاں حسن پہ عشق مچلتا ہے
وہاں پریم کا ساز چلتا ہے — چل دل کی پیاس بجھا جوگی!
وہاں دل کا غنچہ کھلتا ہے — ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی! — بازار میں دھونی رما جوگی!

جوابِ جوگی

ان چکنی چپڑی باتوں سے — مت جوگی کو پھسلا بابا!
جو آگ بجھائی جتنوں سے — پھر اُس پہ نہ تیل گرا بابا!

ہے شہروں میں غل شور بہت　　اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت　　سادھوں کی ہے بن میں جا بابا!
ہے شہر میں شورش نفسانی　　جنگل میں ہے جلوۂ روحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی　　بن وحدت کا دریا بابا!
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں　　چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجا کے نہ دوارے جاتے ہیں　　پرجا کی نہیں پروا بابا!
سر پر آکاس کا منڈل ہے　　دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے　　شب کو تاروں کی سبھا بابا!
جب جھوم کے یہاں گھن آتے ہیں　　مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں　　گاتی ہے ملار ہوا بابا!
یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں　　پیتم کے سندیس سناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں　　پھل پھول اور برگ گیا بابا!
ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمہیں　　اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سل پتھر اینٹ مکان تمہیں　　دیتے ہیں سکھ ہے پھرا بابا!
تن من کو دھن میں لگاتے ہو　　پیتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو　　تم بندۂ حرص و ہوا بابا!
دھن دولت آنی جانی ہے　　یہ دنیا رام کہانی ہے

یہ عالم عالمِ فانی ہے
باقی ہے ذاتِ خدا بابا!

پاداشِ عمل

مقامِ عبرت ہے دَورِ گردوُں۔ ذرا بصیرت کی آنکھ واکر
فلک کے پردوں میں ساز کیا ہے؟ کبھی تو یہ راگنی سُناکر

ہے کیسا یہ انقلاب جاری۔ زماں میں سائر مکاں میں ساری
نہ اِس سے خاکی بچا نہ ناری۔ فلک پہ پہنچا زمیں پہ چھاکر

کہیں بلندی کہیں ہے پستی۔ یہی ہے رمزِ مصافِ ہستی
اِسے اُبھارا اُسے دبا کر۔ اِسے جگایا اُسے سُلا کر

جسل میں دریا میں گلستاں میں۔ ملخ میں ماہی میں انس و جاں میں
سدا قوی اور ناتواں میں۔ رہا تنازعہ جہاں میں آکر

ہے مصر کا گاہ دَورِ دَوراں۔ ہے گاہ یُونان کا فرّہ وشاں
کبھی ہے ایراں کبھی ہے توُراں گئے یہ سب نوبتیں بجا کر

خُدا کی عادت رہی سدا۔ لَا یُغَیِّرُ اللّٰہَ مَا بِقَوۡمٍ
مگر بدلتی رہی ہیں قومیں۔ عمل کی پاداش اپنے پاکر

یہ بحرِ مواج کے تھپیڑے۔ ڈبوتے ہیں غافلوں کے بیڑے
ہیں پہنچے ساحل پہ اہلِ ہمت۔ طلب کے چپّو چلا چلا کر

جو قوم سے لَو لگا رہے ہیں۔ وہ نقدِ جاں تک لُٹا رہے ہیں
وہ کارِ ملّت بنا رہے ہیں۔ بنائیں اپنے گھروں کی ڈھاکر

ہیں جنکے سینوں میں دِل پھڑکتے۔ وہ مشکلوں سے نہیں جھجکتے

ہیں مثلِ پروانہ سر پٹکتے۔ وُہ عشق میں بال و پر جلا کر
ہیں راہرو گرتے پڑتے جاتے ۔رہِ ترقی میں بڑھتے جاتے
ہیں بامِ دَولت پہ چڑھتے جاتے ۔کمندِ ہمت لگا لگا کر
الٰہی خیر اپنے قافلے کی ۔نہیں جسے فکر مرحلے کی
یہ مستِ خواب اب بھی سو رہے ہیں تھکے سب اُنکو جگا جگا کر
کچھ ایسی قسمت ہے اِن کی پھُوٹی۔ کہ اَوجِ عزت کی آس ٹُوٹی
ابھی تو شاخِ مُراد سے یہ ۔گرے ہیں جھُولے جھُلا جھُلا کر
یہ دَولت و ملک و کامرانی۔ تو سب بہاریں تھیں آنی جانی
مگر یہ سیلاب کی روانی ۔ تو لے گئی دین و دِل بہا کر
دِلوں میں اپنے نہاں ہیں کینے۔ بھرے ہیں بُغض و حسد سے سینے
یہ رہ گئے قوم کے دفینے وُہ گنجِ اُلفت لُٹا لُٹا کر
ہے رہنماؤں کا زور ہر سُو ہے پیشواؤں کا شور ہر سُو
بنائے کیا کیا طلسمِ کثرت ۔ وُہ رنگِ وحدت مِٹا مِٹا کر
رہو گے اِس دار و گیر دَوراں میں ۔ہمہ مو ا مستِ خواب کب تک
نبھے گی امواجِ جانستاں میں۔ یہ آن بان اَے حباب کب تک

قومی ناصح

کر سکینگے قوم کا کیا کام ہم خُود غرض۔ خُود بیں ہیں اَور خُود کام ہم

قوم کی اسٹیج پر ہیں جلوہ گر — تاکہ ہوں مشہورِ خاص و عام ہم
کہتے ہیں منبر پہ جن کو نا روا — گھر میں کرتے ہیں وُہی سب کام ہم
منع مے کا صُبح گر کرنا ہو وعظ — شام سے ہوتے ہیں مے آشام ہم
دِل میں پاتے ہیں بُتوں کی آرزُو — باندھتے ہیں حج کا جب اِحرام ہم
کہتے ہیں سجادۂ تقویٰ اُسے — جب بچھاتے ہیں غرض کا دام ہم
کام جو کرتے ہیں خاطر پیٹ کی — قوم کا لیتے ہیں اکثر نام ہم
نفس غالب ہو جو حُبِّ قوم پر — کوششوں کا پائیں کیا انجام ہم
قوم میں ہوتی رہے کچھ چھیڑ چھاڑ — بس یہ سمجھے معنیٔ اسلام ہم
مِل رہی ہیں ہمّتیں آفاق میں — پر کھچے جاتے ہیں صُبح اَور شام ہم

آئے دِن کے تفرقوں سے مِٹ مِٹا
مِٹ چکے اے فِتنۂ ایّام ہم

مُسلمانوں کی حالت

کِسقدر بے ساز و ساماں ہو گئے — کیا تھے ہم اَور کیا مُسلماں ہو گئے
جن سروں پر تھا کبھی بالِ ہُما — آج غیروں کے مگس راں ہو گئے
اہلِ ہمّت اہلِ دَولت اہلِ دیں — رَونقِ شہرِ خموشاں ہو گئے
ہے وُہی اسراف کی لت قوم کو — گرچہ خالی جیب و داماں ہو گئے
صدق عزم و صدقِ دِل سدق مثال — پائمالِ کذب و بُہتاں ہو گئے

تہنیت کا بزم میں دیکھا نہ رنگ لاجرم ہم مرثیہ خواں ہوگئے

آئے ناظر سیر کو وقت خزاں
جب گل و گلزار ویراں ہوگئے

خادمانِ قوم

لی رحمت ہو اہلِ دل پر۔ جو قوم کا غم ہیں کھانے والے
الٰہی! اُن کو بنائے رکھیو۔ ہیں اپنی بگڑی بنانے والے
عزیزو! اِس راہ میں چھوڑ جانا۔ کچھ اپنی غیرت کی یادگاریں
کہ نقشِ پا پر تمہارے لاکھوں۔ ہیں قافلے پیچھے آنے والے
نہیں جہاں میں کوئی ٹھکانا۔ جز آستانِ شہِ دو عالم
کہ جس کے دربار میں ملائک ہیں عجز سے سر جھکانے والے
وہ جلوۂ ذاتِ ذوالجلالی۔ وہ مظہرِ شانِ ذوالجمالی
کہ جس کے در پر سدا سوالی۔ مرادیں دِل کی ہیں پانے والے
وہ اہلِ زور اور اہلِ فن کے طلسمِ حیرت مٹانے والے
وہ چشمِ اہلِ جہاں کو نورِ خدا کا منظر دکھانے والے
وہ ہفت کشور میں عدل و انصاف کی مُنادی کرانے والے
وہ چار دانگِ جہاں میں وحدت کی پنج نوبت بجانے والے
وہ خاکِ یثرب کو سُرمۂ چشمِ اہلِ ایماں بنانے والے

عرب کی بے آب ریگِ صحرا پہ سیلِ رحمت بہانے والے
ہمارے مولا! ہمارے والی۔ ہیں آستاں پر ترے سوالی
یہ نونہالانِ باغِ قومی کو گودیوں میں کھلانے والے
سلام وصلواۃ تم پہ لاکھوں۔ شفیعِ روزِ جزا ہمارے
نہیں ہے بیڑے کو خوفِ طوفاں جو آپ ہیں ناخدا ہمارے

افسر الشعرا آغا شاعر صاحب قزلباش دہلوی

تعارف

آپ کا اصلی نام تو کچھ اور ہے۔ لیکن عوام میں آغا شاعر کے نام سے ہی مشہور ہیں۔ عمر قریباً ساٹھ سال کے لگ بھگ ہے۔ آپ فصیح الملک جناب میرزا داغ دہلوی کے قدیم شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ کی غزلوں کا دیوان الموسوم بہ "تیر و نشتر" شایع ہو کر شرفِ قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ آپ زمانۂ حال کے نامی گرامی قادر الکلام اُستادوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور آج کل مہاراجہ جھامرا پاٹن راجپوتانہ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہیں۔ رسالہ آفتاب تقریباً دو سال سے آپکی ادارت میں نہائت حسن و خوش اسلوبی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ آپکے رشحۂ قلم سے کئی ناول یادگار ہیں۔ آپ کا کلام دورِ حاضرہ کی اُردوئے معلےٰ کی مکمل تصویر ہے۔ محاورے کے ساتھ روزمرہ کی کھپت اِس شُستگی و برجستگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ کہ کلام میں ایک خاص قسم کی شیرینی اور طرفگی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپکے متعلق اگر یہ کہا جائے۔ کہ اپنے اُستاد میرزا داغ دہلوی کے بعد اردوئے معلےٰ کو فارسی کی تراکیب اور مُغلق الفاظ سے کسی اور شاعر نے اسقدر پاک نہیں کیا۔ تو شائد حقیقت کے خلاف نہ ہوگا۔ آپ کی پُرگوئی کا یہ عالم ہے۔ کہ تھوڑے سے وقت میں بڑی بڑی نظمیں کمال بے تکلفی کیساتھ سرانجام کر سکتے ہیں۔ نثر نویسی میں بھی آپ پوری قدرت رکھتے ہیں اور ایک طرزِ خاص کے موجد ہیں۔

وجدانِ حقیقی

وجدانِ حقیقی سے طبیعت کو شرف ہے
جتنا کہیں اِس کیف کو وُہ حق بہ طرف ہے
چھینٹے نہ ہوں نیساں کے تو بیکار صدف ہے
جوشش ہی کے دم سے لبِ جو موج میں کف ہے

کوسوں بھی تو بہتا ہُوا دھارا نہیں ملتا
چڑھ جائے یہ دریا تو کنارا نہیں ملتا

گوہر جو اُگلتا ہے۔ یہ شاعر کی ہے فطرت
ایسی نہیں ہوتی ہر اِک انسان میں قدرت
خُود وجد کو پیدا کرے اِتنی نہیں طاقت
خلاقِ جہاں کرتا ہے اِس شے کو وَدِیعت

حِصّہ نہیں جس کا۔ اُسے دَولت نہیں ملتی
نا اہل کو مر کر بھی یہ نعمت نہیں ملتی

کچھ حرص و ہوا سے نہیں یہ رنگ چمکتا
جس پھُول میں خُوشبو نہ ہو وُہ کب ہے مہکتا؟
بے موج ہوا بھی کوئی شعلہ ہے بھڑکتا؟
دیکھا ہے کہیں طائرِ تصویر چہکتا؟

یہ جوہر ذاتی ہے زبانی نہیں ہوتا
کچھ نقل سے خلاق معانی نہیں ہوتا

توبہ کرو۔ بے فائدہ نہیں نظم کے تیور
بنتا ہے بنائے سے کہیں کوئی سخنور؟
الماس سے ہم پلّہ ہُوا ہے کہیں پتھر؟
تلوار وُہ ہے جس میں کہ ذاتی بھی ہوں جوہر

اَسوار جہاں جاتے ہیں پیدل نہیں چلتے
ہر شخص کے اِس فن میں تو کَس بَل نہیں چلتے

غیروں کے خزانے سے جواہر بھی جو لائے
اَور خیر سے بیقاعدہ محفل میں سجائے

تن تن کے بڑے فخر سے ایک ایک کو دِکھائے   پھر آپ کا کیا حق ہُوا۔ وُہ تو ہیں پرائے؟

یُوں داد نہیں ملتی ہے۔ بیداد نہ کیجے
للہ دماغ اُڑتا ہے فریاد نہ کیجے

کیوں مضحکہ بنتے ہو۔ اُٹھائیگا یہ غم کون   خاموش رہو بزم میں۔ کہتا ہے ہم کون؟
جس فن سے علاقہ نہیں تُم اُسکے حکم کون   اِتنا بھی نہیں سُوجھتا تُم کون ہو۔ ہم کون؟

ہم اِس لئے حقدار ہیں ہر طرح اثر کے
کاغذ پہ نہیں لفظ۔ یہ ٹکڑے ہیں جگر کے

نوروز عالم افروز

خُدا کے فضل سے ہم سالِ نَو کو دیکھتے ہیں
نئی روش۔ شہِ خاور کی ضَو کو دیکھتے ہیں
ہماری عُمر سے گو ایک سال پِچھ گیا
مگر زمانے کا یہ اِک قدم ہے اور بڑھا
نظر پڑی جو نئے دِن کی صُبح آتے ہُوئے
اُڑے پرند درختوں سے چہچہاتے ہُوئے
زمین پہ پہلی کرن مہر نے جو ڈالی ہے
تو زرنگار۔ ہر اِک پھُول کی پیالی ہے
بچی کھچی ہوئی شبنم کی جو شراب ڈھلی

تو اُس کی چُسکی لگاتے ہی ھر کلی جھومی

تغیرات ہیں۔ شام و پگاہ کی گردش
بدل رہی ہے سُپید و سیاہ کی گردش

جہاں میں اب ہے نئے ہم جلیس کا دَورہ
تمام ہو گیا اُنّیس سو بیس ۱۹۲۰ کا دَورہ

نالۂ یتیم

ایمان والو چین سے بیٹھے ہوئے ہو اپنے گھر
ہے کیا ضرورت یہ تمہیں لو دردمندوں کی خبر

تُم پیٹ بھر کر کھاتے ہو تُم ٹھنڈا پانی پیتے ہو
ہم بھوکے پیاسے پھر رہے ہیں مارے مارے دربدر

پہنو لباس فاخرہ اچھی سے اچھی ہے قبا
ہم کو بھی دیکھو تو ذرا چیتھڑا نہیں ہے جسم پر

تُم اُونچے محلوں میں رہو پھر روشنی بجلی کی ہو
ہم کو ہیں قبروں کے گڑھے ہم سے تو اچھے جانور

وُہ نرم بستر اور تم یہ خاک پتھر اور ہم
انصاف کہتے ہیں اِسے کیوں جی مِلاؤ تو نظر

اولاد والے تُم بھی ہو رکھو کلیجہ پر تو ہاتھ

ہم کس کے سینے سے لگیں کس کو کہیں مادر پدر
بچے تمہارے خوش رہیں کرتے ہیں وہ کیا کیا ضدیں
ہم جھڑکیاں کھاتے پھریں آخر یہ کیوں کس جرم پر؟
ہم بھی خدا کی جان ہیں کچھ بھی سہی انسان ہیں
پھر صاحبِ ایمان ہیں ایمان کی تو لو خبر
ہم واجب الامداد ہیں حق ہے ہمارا بھی جناب
صورت سے کیا بیزار ہو بھولے ہو کیا ام الکتاب

مذہب بدل لیں کیا کریں کچھ اور ہی کہلائیں ہم
تم تو نہیں سنتے ذرا آخر کہاں مر جائیں ہم
ناٹک میں ناچیں کیا کریں منچانوں کی چلمیں بھریں
یا جھوٹے ٹکڑوں سے پلیں بھوکے ہوں تو کیا کھائیں ہم
چوری کا لپکا ڈال لیں یا داؤں جا جا کر بدیں!
عریاں ہیں تن کیونکر ڈھکیں چادر کہاں سے لائیں ہم
ناتوں سے ہم ہیں نیم جاں گن لو ہماری پسلیاں
محنت کے ہم قابل کہاں اٹھ اٹھ کے جب گر جائیں ہم
کہتے ہیں آسائش کسے ہم جیسے آئے تھے چلے
پیدا ہوئے تو کس لئے کس کام کو دکھلائیں ہم
جب دل ہمارا ہل گیا تو عرشِ اعظم ہل گیا

قدسی تڑپ جائیں ابھی آنسو اگر بھر لائیں ہم
اللہ کے پیارے ہیں وُہ جو پیار کرتے ہیں ہمیں
تُم سمجھے بُوجھے آپ ہو کِسطرح سے سمجھائیں ہم
تُم سایۂ دامن میں لو تُم ہاتھ تو سر پر رکھو
خوفِ خُدا کچھ تو کرو ایسا نہ ہو مِٹ جائیں ہم
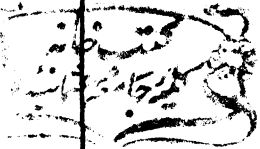
بہارِ ہندوستان

نیا سال تقدیر نے پھر دِکھایا　　زمانے کا گلشن بہاروں پہ آیا
شگوفے کھِلے کونپلوں کو سجایا　　درختوں نے شاخوں کو دُلہن بنایا
کھِلے پھُول۔ سبزے لہکنے لگے ہیں
گُلستاں میں بُلبُل چہکنے لگے ہیں
چلو چل کے تربینی کا رنگ دیکھیں　　نظر کی کمندیں ہمالہ پہ پھینکیں
وُہ گنگا کی رَو۔ تاپتی کی وُہ سوتیں　　وُہ شاداب رمنے۔ وُہ سوتوں کی جوتیں
آہاہا عجب اُس کی قُدرت عیاں ہے
بہشت بریں ہے کہ ہندوستاں ہے
نہیں مینہ برس کر وُہ کھُلنا۔ آہاہا　　وُہ ہر پھُول پتّی کا دُھلنا۔ آہاہا
وُہ قطروں کا کانٹے میں تُلنا۔ آہاہا　　گُل و سبزہ کا مِلنا جُلنا۔ آہاہا
مُبارک ہو! اَے ہند! تُجھ کو فضائیں:

یہ سبزہ - یہ گُل اور یہ اُودی گھٹائیں:
سروں پہ وُہ نیلا ہٹیں آسماں کی دھنک ترچھی ترچھی وُہ بانکی کماں کی
اچانک جھلک مہر شعلہ فشاں کی کہوں کیا کہ قدرت نہیں ہے بیاں کی
نظر باز ہی کوئی پہچانتا ہے
کہ جو دیکھتا ہے وُہی جانتا ہے
یہ سب کچھ مناسب! مگر اے مری جاں مجھے دل سے بھاتا نہیں کوئی ساماں
تری مدح حاضر ہے گو میرا ایماں میں سو بار ہندوستاں تجھ پہ قرباں
مگر کیا کروں دل میں سوزِ نہاں ہے
جو سچی خوشی ہے وُہ پیارے کہاں ہے
ہے دورانِ خون مجھ کو شُعلہ کی تیزی ہوا معتدل تیز ہے اِک چھُری سی
یہ فصلِ بہاری خزاں پوری پوری یہ بارانِ رحمت گھٹائیں ہیں غم کی
تیری آبیاری سے لب تشنہ ہوں میں
ستم دیدۂ زخم صد دشنہ ہوں میں
نہ پاسِ حمیت - نہ ہے پاسِ غیرت تجھے غیر سے لُطف اپنوں سے نفرت
تو اوروں کا محتاج اوروں سے بیعت خُدا ہی سنبھالیگا اب تیری حالت
بہت فقر و فاقہ میں اپنی کٹی ہے
شریفوں کے بیٹوں پہ بپتی بندھی ہے
بھروسہ نہیں اپنے اُوپر جو تجھ کو یہی تو قیامت ہے اب تجھ سے کیا ہو
تری مُفلسی ہاں اُٹھ جائیگی یوں تو سمجھتا ہے شل اپنے ہی بازوؤں کو

بھلا حال کیا اُس کا ہندوستاں! ہو

جو اپنے لئے آپ بارِ گراں ہو

ذریعے جو قُدرت نے ہیں تجھ کو بخشے اُنہیں پر بھروسہ کرے کرکے دیکھے

خدا یا ہے بس پھر تو ہیں پار بیڑے تفکّر ہزاروں ہوں تیری بلا سے

خبردار! یہ فکر بے جا نہ کرنا!

فلک کی دو رنگی کی پروا نہ کرنا!

چٹانوں کو دیکھا ہے مَیں نے یہ اکثر تھپیڑے سمندر کے کھاتی ہیں جم کر

پڑے غار پر غار جسموں کے اُوپر مگر توبہ توبہ سرکتا ہے لنگر

وُہ جس طرح قدموں کو گاڑے کھڑی ہیں

اُسی طرح پانی کو بھاڑے کھڑی ہیں

مُرقع نشاط

گلزارِ جہاں رحمتِ باری سے بھرا ہے قُدرت کے قلمکار کا ہر نقش کھرا ہے

جو برگ ہے عکسِ خطِ جوہر سے بھرا ہے آئینہ ہے تصویر کے آگے جو دھرا ہے

کب دِید کی طاقت ہوئی تھکنے لگیں آنکھیں

خیرہ ہُوئی جاتی ہیں جھپکنے لگیں آنکھیں

وُہ صُبح دمِ صُبح کی وُہ نُور فشانی شاداب چمن زار میں نتھرا ہُوا پانی

سوئے ہُوئے سبزے میں دبے پاؤں روانی دیکھا نہیں یُوں پرچہ الماس کو دھانی

سو رنگ سے مضمون سنورنے لگے دیکھو
عکسِ گلِ خورشید اُترنے لگے دیکھو

وہ دستِ سُبک موج کا تھم تھم کے لگانا پھیلے ہوئے دامن کا سمٹتے ہوئے آنا
پھولوں کا اُبھرنا کبھی غنچوں کا لجانا لالے نے دبایا ہے تہِ آب خزانا

اب اِن کے کرشموں پہ نظرِ غیر کرینگے
مُنہ دھو کے سیناں چمن سیر کرینگے

راحت کے کہاں تک شجرِ سبز مزے لیں جنبش میں ہیں شاخیں کہ وہ بیدار ہوں کھیلیں
شبنم بھی تو موجود ہے چھینٹے ذرا دے لیں انگڑائی وہ لی کروٹیں لینے لگیں بیلیں

کیا ناگنیں ہیں شوخیٔ رفتار کے اُوپر
بل کھا کے چڑھی جاتی ہیں دیوار کے اُوپر

ہیں سُرخ کہیں زرد کہیں پھول ہیں آبی تصویر سے تصویر نکلتی ہے جوابی
ڈھاتی ہے سرِ بزم گُلابی پہ گُلابی ہیں ڈالیاں لغزش میں کہ بدمست شرابی

دلشاد ہیں سب گود میں غنچے ہیں پری سے
گُل بازیاں ہوتی ہیں نسیمِ سحری سے

شورش میں ہیں طائرِ ورقِ گُل کی چمک سے مُکسی ہوئی کلیاں بھی تو اُڑتی ہیں مہک سے
چنگاریاں گرتی ہیں جو غنچوں کی لچک سے بُلبُل نے لگادی ہے نئی آگ چہک سے

نغمے کی صدا جب کوئی منقار سے نکلی
شُعلے کی لپک آتشِ گُل زار سے نکلی

مُرغانِ چمن کے لئے بُلبُل کا اِشارا بازو دہیں گویا کہ پڑا اُڑ کے شرارا

یا تیر تھا۔ جو نعرۂ مستانہ نے مارا پھر کیا تھا وہ چھکے کہ چمن اُڑ گیا سارا

رہ رہ کے ترنّم کی صدا گونج رہی ہے
سُن ہیں در و دیوار ہوا گونج رہی ہے

طرزِ قدیم

جب مرے ہونٹوں سے لعلِ شکریں چھوٹے ہوئے لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب ٹوٹے ہوئے
بزمِ دشمن سے اب آئے ہو مرے لوٹے ہوئے؟ ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے
تم یہاں دیکھو تو آ کر ہجر میں کیا حال ہے؟ دل کے ہاتھوں آج سو سو حشر ہیں ٹوٹے ہوئے
وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی دو ہی دن گذرے تھے ہم کو قید سے چھوٹے ہوئے
چاہنے والے تری فرقت میں جی سکتے نہیں زندگی سے ہیں ناداروں کے جی چھوٹے ہوئے
دلفریبی لالہ رویوں کی نہیں مٹتی کبھی یہ ستمگر خاک ہو کر بھی تو گل بوٹے ہوئے
سچ یہ ہے۔ گریہ کسی کی آگ میں اچھا نہیں دل کو روتے ہیں جگر کے آبلے پھوٹے ہوئے
شمع کا آنسو نہیں تھمتا ہے اُنکی یاد میں اُڑتے پھرتے ہیں جو پروانوں کے پر ٹوٹے ہوئے
اپنی سوزش کا کیا ہے شمع نے اچھا علاج رکھ لئے ہیں دل میں پروانوں کے پر ٹوٹے ہوئے

سونگھ لے شاعرؔ اگر ہے کچھ دماغ بوئے گل
میرے گلشن کے یہ تازے پھول ہیں ٹوٹے ہوئے

منشی سُورج نرائن صاحب مہرؔ دہلوی

تعارف

منشی سُورج نرائن مہرؔ دہلوی بڈھے آدمی ہیں اور ذات کے کائستھ ابھی عالمِ شباب میں پاؤں رکھنے ہی پائے تھے کہ شعرو سخن کا چسکا لگ گیا۔ اور یہ چسکا ایسا لگا، ایسا لگا۔ کہ آج تک طبیعت ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔ آپ کی شاعری حُسن وعشق کی بندشوں سے قطعاً آزاد ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ شاعری حُسنِ اخلاق کو جلا دینے کے لئے ہے شہوانی جذبات کو بھڑکانے کے لئے نہیں آپ کے دو دیوان جو اِسوقت تک شایع ہو چکے ہیں۔ اُن کا ایک ایک صفحہ اور ہر ایک صفحے کا ایک ایک شعر آپکے خیال کی بہترین توضیح ہے۔ آپ کا کلام رنگین نہیں ہوتا۔ اُسکا ایک ایک مصرعہ جادو کے اثر میں شرابور نہیں نِکلتا۔ اِسے آپنے اپنے دیوان میں خود تسلیم کیا ہے۔ تاہم یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے۔ کہ آپ کے کلام میں اُستادوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ کا توسنِ قلم کبھی ٹھوکر نہیں کھاتا۔ آپکے کلام میں بیشتر ویدانت کا رنگ غالب ہے۔ اِسی شُغل میں دن رات مگن رہتے ہیں۔ آج کل دہلی سے ساؔدھو نامی رسالہ نکالتے ہیں۔

شان الٰہی

صنعت میرے صانع کی کیا لاانتہاہی ہے چشم مہر و خور دیکھو کیا تیز نگاہی ہے
افلاک معلق ہیں کیا پُشت پناہی ہے ہر اک کُرہ بن بیٹھے آکاش میں راہی ہے

کیا شان الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

کونین کی کل کیونکر باقاعدہ ہے چلتی جو کام ہے جس شے کا کیوں اس سے نہیں ٹلتی
کیوں مشعل مہر و مہ ہے شام و سحر جلتی عاجز ہے خرد اس جا کچھ دال نہیں گلتی

کیا شان الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

دُنیا جسے کہتے ہیں ہے کارگہ صنعت ہر شے سے عیاں ندرت ہر شے سے عیاں جدت
انسان کو حیرت ہے، واللہ ہے کیا حکمت طائر ہیں نوازن یوں سبحان تیری قدرت

کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

دریا ہے بہا جاتا پانی ہے چلا آتا آتا ہے کہاں سے یہ مڑتا ہوا بل کھاتا
اس طرح دھکیلے کون اسکو ہے لئے جاتا حیران ہے اک عالم کچھ تھاہ نہیں پاتا

کیا شان الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

ہوتی ہے پہاڑوں سے ذی ہوش کو بیہوشی کرتی ہے کھڑی چوٹی افلاک سے سرگوشی
پھر روز ازل ہی سے یوں برتے ہیں تن پوشی کہتے ہیں طبیعی کی یاں آن کے خاموشی

کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

گلزار میں اور بن میں دیکھو تو ذرا ہر سو لکڑی میں ہے کیا صنعت لکڑی میں ہے کیا جادو
لکڑی ہے ہرے پتے لکڑی ہے گل خوش رو لکڑی ثمر شیریں خوش ذائقہ و خوشبو

کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

دیکھو تو پہاڑوں میں آتے ہیں نظر پتھر پتھر میں مگر پنہاں ہے معدن سیم و زر
ہے بحر بھی کہنے کو مچھلی کا مگر کا گھر خوش آب دلے موتی اِس بحر کے ہیں اندر

کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

کہتے ہیں ہوا جس کو سرمایہ ہے جینے کا اور خاک دفینہ ہے ہر ایک خزینے کا
سوز آتش سوزاں میں عشاق کے سینے کا لُطف آب مصفا میں ہیرے کے نگینے کا

کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

تھی بند ہوا کل سے اور سخت تھی دشواری ہے آج نظر آتی کچھ اور ہی تیاری
وُہ دیکھو چلی آتی آندھی ہے بڑی بھاری وُہ آ ہی گیا جھکڑ وہ گرد ہوئی طاری

کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

تھا صاف ابھی مطلع اور نام نہ بادل کا ہم دیکھ رہے ہیں سب یکبار وُہ ابر اُٹھا
وُہ برق ذرا چمکی وُہ رعد ذرا گرجا بل تھل ہوئے دم بھر میں مطلق سی مینہ برسا

کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

اِک خاک کے پُتلے کو اِنسان بنایا ہے کل اسمیں عجب رکھ کر حکمت سے چلایا ہے
وُہ عقل و خرد کا گُر پھر اُسکو سکھایا ہے انساں کے فرشتوں کے درجے پہ چڑھایا ہے

کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

قُدرت کے کرشمے وُہ نقشے ہیں طلسماتی حیران ہیں سب شہری حیران ہیں دیہاتی
حکمت بھی حکیموں کی یاں راہ نہیں پاتی آخر یہی کہتے ہیں جب کچھ نہیں بن آتی

کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

اوروں کی طرح یارب ہے مجھ کو حیرانی لیکن نہیں دُنیا سے کچھ اسکو پریشانی
اس بات کا طالب ہے جلوہ ترا رُوحانی دیکھے تو پڑھے ہردم یہ مصرعۂ لاثانی
کیا شانِ الٰہی ہے کیا شانِ الٰہی ہے

صدائے دوست

کیا شوق جاں گزا کی کہانی سُناؤں میں دِل کس طرح سے کھول کے تجھ کو دِکھاؤں میں
آتا ہے کون یاد تجھے کیا بتاؤں میں تو مجھ کو یہ بتا تیرے قربان جاؤں میں
آواز کس کی تُونے اُڑائی ہے اے ستار
بیخود ہوئے ہیں سُن کے شہنشاہ اور گدا آہنگ کیا ہی مست ہے کیا دلفزا صدا
پُوچھے جو کوئی مجھ سے کہونگا یہی سدا باجے کو کب نصیب ہے یہ لحنِ خوش ادا
کب چھیڑنے سے یُوں مترنم ہوئے ہیں تار
آواز ایسی مست ہوں سُن سن کے سامعیں لکڑی سے اور دھات سے نکلی بھی ہے کہیں
مجھ کو قسم خُدا کی صدا تیری یہ نہیں پردہ نشیں مرا پسِ پردہ ہے جا گزیں
پردوں سے اُس کی آتی ہے آوازِ خوشگوار
پردہ ہے تجھ سے کیا کہ میں ہُوں مُبتلائے دوست قربانِ یار جان ہے اور دل فدائے دوست
کر اکتفا نہ مجھ کو سُنا کر نوائے دوست سنوائی جس طرح سے ہے تونے صدائے دوست
دِکھلا بھی دے کبھی مجھے ظالم جمالِ یار

ادائے فرض

۳۱

کل اِک گُلاب کا پودا مجھے نظر آیا — کسی کھنڈر میں کھڑا شہر تھا باغ سے دُور
پڑے ہیں برگ اٹے گرد کس مپرسی میں — برائے نام ہے شاخوں میں کچھ نمی کا ظہور
بس ایک پھول شگفتہ ہے اِسکی ٹہنی پر — کہ اسکو دیکھ کے آتا ہے جانِ دل میں سرور
نہ دیکھتا تھا کوئی لیک اسکا رنگ تھا شوخ — نہ سونگھتا تھا کوئی بُو تھی عطر بیز ضرور
خیال دل میں مرے بار بار یہ آیا — کہ دیکھئے تو ہے کیا قدرتِ خدائے غفور
کھڑا ہے یہ گل خوش رنگ یکہ و تنہا — نہ دیکھنے کو جہاں آدمی ہیں اور نہ طیور
مگر اسے نہیں پروا کہ میں کھڑا ہوں کہاں — سراہتے ہیں مجھے یا نہیں جنہیں ہے شعور
ادائے فرض میں بے شک و شبہ ہے سرگرم — کہ رنگ و بُو کی نمائش میں ہو نہ جائے قصور
ادائے فرض میں سرگرم ہے مگر اِس کو — نہ ہے خیال ستائش نہ مدح کچھ منظور

یہی طریقۂ نیکاں ہے یاد رکھ اے رہبر
کہ کام کام سے ہو نام گو رہے مستور

عمرِ رواں

اے رہبر گیا قافلۂ عمرِ رواں — کس سوچ میں بیٹھے ہو اٹھو میری جاں
گھڑیال گھڑی نہیں بجتی ہے — آوازِ جرس کی آرہی ہے ناداں

ناصیت عمر جب کہ ٹھیری گزراں
اے مہر گزر جائیگی یہ عمر رواں
راحت میں بسر ہوئی تو کیا سود ہوا
اور رنج میں گزری تو ہوا کیا نقصاں

دردِ سر و چشم و گوش و دنداں ہے مدام
کمزوریِ اعصاب سے ہے زیست حرام
اے مہر علاج اور دوا کب تک
بس یوں سمجھو کہ ہو چکی عمر تمام

اچھی بری سب تیری گزر جائیگی
ہے حق کی رضا جیسی گزر جائیگی
اے مہر بہت گزر چکی عمر رواں
تھوڑی سی رہی یہ بھی گزر جائیگی

ٹکاؤ کہیں ہے نہ کسی جا ہے قیام
ہے موڑ کہیں اور نہ جگہ کا مقام
دیکھے جو کبھی روانئے عمر رواں
لے آبِ رواں نہ پھر روانی کا نام

ہے آبِ رواں میں بھی روانی ہرچند
رک جاتا ہے لیکن وہ اگر باندھیں بند
اے عمرِ رواں تری روانی نہ رکی
تدبیریں ہزار کر چکے دانشمند

ارماں نکلا نہ کوئی حسرت نکلی
جو بات تھی مہر دل کی دل ہی میں رہی
تھی عمرِ رواں مگر سمندر کی لہر
اٹھی اور اٹھ کے بس وہیں بیٹھ گئی

فکرِ فردا

شہد کی مکھیوں کے در پر جا — کسی جھینگر نے یوں سوال کیا
مائیو میں ہوں اک غریب فقیر — دردِ افلاس سے بہت دلگیر
آج کل کس غضب کا پالا ہے — مجھے سردی نے مار ڈالا ہے
تمہیں اللہ نے دیا سب کچھ — بھیک دو مجھ غریب کو اب کچھ
راہِ مولا ذرا سا شہد پلاؤ — دین و دنیا کا تم ثواب کماؤ

مکھیوں نے کہا میاں جھینگر — جسم میں تم ہو ہم سے بڑھ چڑھ کر
دست و پا گر ہلاتے گرمی میں — مرتے ہرگز نہ بھوکے سردی میں
یا کہ برسات کے تھے جب ایام — اُن میں محنت سے تم جو کرتے کام
جمع اچھا ذخیرہ ہو جاتا — آج کل وُہ تمہارے کام آتا
بولا جھینگر بہت ہوں میں کمبخت — مجھ کو قسمت کی ہے شکایت سخت
جبکہ گرمی تھی یا کہ تھی برسات — میں نے گانے میں کھوئے دن اور رات
نہیں جاڑے کا کچھ خیال آیا — جمع کرتا کہاں سے سرمایا
اب مجھے کچھ خدا کی راہ پہ دو — بھاگو! تو بھلا تمہارا ہو

مکھیاں اس سے بولیں کہ جھینگر — چین سے جا تو بھائی اپنے گھر
جب جو گاتا رہا تو اب بھی گا — اور کھانے کی جا ہوا تو کھا

کل کا جو فکر آج کرتے ہیں　　کبھی بھوکے نہیں وہ مرتے ہیں

نہ سمجھ مہر یہ کہانی ہے　　گر تجھے شوق راز دانی ہے
جھینگروں کی ہے یاں فراوانی　　اِن کا جامہ ہے گرچہ انسانی
جب جوانی کی ہوتی ہے برسات　　کھوتے لہو و لعب میں ہیں دن رات
یا کہ پھرتے ہیں مست گلیوں میں　　رہتے بیخود ہیں رنگ رلیوں میں
نہیں دِل پر ذرا ملال آتا　　نہیں پیری کا کچھ خیال آتا
فکرِ عقبےٰ نہیں پھٹکتا پاس　　نہیں مرنے سے دِل کو خوف ہراس

ہیں جوانی کے دِن مگر گزراں　　اور پیری کی آنے والی خزاں
سخت پڑنے لگیگی جب سردی　　سخت محسوس ہو گی بے دردی
جمع ہوگا نہ جب ذخیرہ کچھ　　بیٹھ کر گھر میں کھائینگے کیا کچھ
بے کسی اور ضعف کا پالا　　جب پڑے گا تو ہو سکیگا کیا
موئے سر برف کی طرح سے سفید　　ہوگئے جب تو کیا رہیگی اُمید
مضمحل جب ہوئے قوےٰ سارے　　سوچ تو کیا کریں گے بیچارے

جیب سے ہیں ابھی نکلتے ہاتھ　　کرلے کچھ مہر تو بھی چلتے ہاتھ
چھوڑ ابھی سے خیال دُنیا کا　　کر ابھی سے تو فکرِ عقبےٰ کا
ورنہ کیا ہوسکیگا اے بھائی　　موت کی جب گھڑی قریب آئی

مجھے اس دن کا آج رونا ہے تجھ سے کیا بیکسی میں ہونا ہے
وقت آیا ہُوا نہیں ٹلتا زور انسان کا نہیں چلتا
یاد آتا ہے مجھ کو قولِ حکیم کر عمل اس پہ تو اگر ہے فہیم
زندگی کا یہی مآل رہے
تجھے آگے کا کچھ خیال رہے

یاس

کچھ بھی نہ ہُوا صفائے باطن کا ظہور اے مہر وہی ہم ہیں وُہی دِلی دُور
پھل دیتی ہے کچھ ہمیں ریاضت کہ نہیں اللہ کو دیکھتے ہیں کیا ہے منظور

افسوس کہ کچھ نیک کمائی نہ ہوئی آئینہ قلب کی صفائی نہ ہوئی
ظلمت کا حجاب ہی رہا پیشِ نظر انوار کی کچھ جلوہ نمائی نہ ہوئی

شہر و بازار و گلستاں میں ڈھونڈھا دشت و کہسار و بحر و مکاں میں ڈھونڈھا
جلوے تو نظر آئے تری قدرت کے پھر تو نہ ملا تجھے جہاں میں ڈھونڈھا

دُنیا کی لذائذ میں مزا کچھ نہ رہا تھا شوقِ دیدِ حق وُہ پُورا نہ ہُوا
ہم مہر اِدھر کے نہ اُدھر کے ہی رہے دُنیا بھی گئی اور خدا بھی نہ ملا

کھانے میں مزا رہا نہ پانی میں مزا — آتا نہیں کچھ بھی زندگانی میں مزا
بیگانگیٔ طبیع نے مارا مجھ کو — دنیا کی نہیں رام کہانی میں مزا

ہر وقت خیال تجھ کو ہر بات کا ہے — ہر وقت تصور تجھے لذات کا ہے
اے دہر تجلی ہو تو پھر کیونکر ہو — بندہ نہیں حق کا تو خیالات کا ہے

پڑھ پڑھ کے کیا دماغ اپنا خالی — لیکن افسوس کچھ تجلی نہ ہوئی
دیوانے کو دہر ایک ہو کافی ہے — کافی نہ ہوئے تجھ کو کتب خانے بھی

ریا

گمراہ کو اپنے بس میں لانے کے لئے — دانے ہیں اس میں دل لبھانے کے لئے
تسبیح نہیں ہاتھ میں تیرے اے شیخ — دام تزویر ہے پھنسانے کے لئے

یہ خرقہ و عمامہ و تسبیح دراز — یہ روزہ و اوراد و وظائف و نماز
دنیا کے دکھانے کا ہے اچھا ساماں — کچھ حق کے دکھانے کا بھی اے شیخ ہے ساز

بچپن سے کٹی عمر سیہ کاری میں — اوباشی و بدکاری و عیاری میں
جب ہو گئے مضمحل قوے سارے شیخ — مصروف ہوئے ہیں آپ دینداری میں

کچھ کسب کمال کا ظہورا نہ ہُوا
جو کام کیا رہا ادھورا نہ ہُوا
ہر فن مولے تو ہو گئے ہو اے مہر
پر ایک بھی فن آپ سے پُورا نہ ہُوا

دُنیا کو نصیحتیں سُناتا ہے یہ
کب آپ عمل میں اُن کو لاتا ہے یہ
ناصح ہے مگر مہر ترا مشعلچی
اوروں ہی کو روشنی دِکھاتا ہے یہ

ہے ہستیٔ حق پہ تجھ کو ظاہرا قرار
منکر ہے وگرنہ شرک ہے تیرا شعار
جب واحد و لاشریک ٹھیرا اللہ
اے شیخ بتا کہاں رہا تیرا شمار

ہے محض کتاب لادنے ہی کا گدھا
یا عِلم پہ کچھ تُو نے عمل بھی ہے کیا
گر علم نہیں ہے باعمل اَے ناداں
تو تُو نے پڑھا لِکھا ڈبویا سارا

سرجو کا گڑھ

پڑا جاں بلب اِک پُوربیا سپاہی تھا میدان میں مصر کے زخم کھائے
نہ واں کوئی عورت تھی اُسکی خبر کو نہ واں کوئی عورت جو آنسو بہائے
ولے اِک سپاہی برابر کھڑا تھا۔ جراحت سے جب اُسکے تھا خون جاری
نگاہِ ترحم سے جھکتا تھا پیہم۔ کہ جو کچھ کہے سُن لے باتیں وہ ساری
پکڑ ہاتھ ساتھی کا ہاتھوں میں اپنے بہت کانپ کرجاں بلب و مُضطر

وُہ کہنے لگا اب نہ دیکھونگا گھر میں نہ پیارا وطن بھائی دیکھونگا جا کر
پیام ایک اَور یادگار ایک میرا - مرے چند احباب کے پاس لے جا
وہیں دُور - پیدا ہیں گڑھ میں ہُوا تھا - وُہ گڑھ جو کہ سرجو کنارے ہے بستا

مرے بھائیوں اور یاروں سے کہنا وُہ ہوں جمع جس وقت اَور مِل کے بیٹھیں
وہاں گاؤں کی آگے چوپاڑ میں سب بتھا درد غم کے مری - تا کہ سُن لیں
کہ ہم یہ لڑائی لڑے تھے دلیری سے اَور ختم واں روزِ روشن ہُوا جب
تو سورج کے نیچے جواب ڈوبتا تھا ہزاروں ہی لاشیں تھیں پلی پڑی سب
بہت زخمیوں اور کشتوں میں ایسے تھے جنگ و جدل میں جو بُڈھے ہُوئے تھے
اور اب زخم آخر تھے وُہ زخم کاری جو مردانہ سینوں پہ اُن کے لگے تھے
بہُت تھے جواں - زندگی کی سحر کو یکایک جنہوں نے یہاں ڈھلتے دیکھا
اُنہیں میں سے اِک شخص آیا تھا گڑھ سے - وُہ گڑھ جو کہ سرجو کنارے ہے بستا

میری ماں سے کہنا ترے اَور لڑکے ہیں آرام پیری میں وُہ دینگے تجھ کو
کہ میں تو سدا سے تھا آوارہ ایسا کہ گھر تھا قفس ہوتا معلوم مجھ کو
سبب یہ کہ تھا باپ میرا سپاہی اَور ایامِ طفلی میں دِل میرا اکثر
اُچھلتا تھا سُنکر وُہ قصّے لڑائی کے پڑتا تھا رن جن میں گھمسان آ کر
مَرا جب وُہ اَور ہم نے آپس میں بانٹی غریبانہ میراث جو اُس نے چھوڑی
تو جو کچھ کہ چاہا لیا بھائیوں نے فقط اُسکی تلوار اِک میں نے لے لی

جہاں نُور تھا مہرِ تاباں کا پڑتا اُسے چاؤ سے مَیں نے بچپن کے مانگا
وہاں گڑھ میں ۔ دیوار پر جھونپڑی کی۔ مُہ گڑھ جو کہ سرجو کنارے ہے بستا

بہن سے مری کہنا۔ وُہ ہچکیاں لے نہ روئے مجھے اپنی گردن جھکائے
وطن میں پہنچکر رسالہ ہمارا اکڑتا ہُوا اور خوش خوش جب آئے
اُسے فخر اور ناز سے بلکہ دیکھے ۔ نظر اُس کی ہرگز نہ جھپکے نہ کانپے
کہ بھائی تھا اُس کا بھی پُورا سپاہی نہ ڈرتا تھا جو جان پر کھیلنے سے
اور اس سے ذرا میری جانب سے کہنا کہ شادی کو تجھ سے سپاہی کوئی گر
کہے۔ تو بلا رنج و افسوس کے تُو تلطف سے اُس پر نظر کیجو خواہر
اور اس میری اور باپ کی تیغ کو تُو جہاں تھی یہ پہلے وہیں دیجو لٹکا
شرف اور عزّت رہے تاکہ گڑھ کی ۔ وُہ گڑھ جو کہ سرجو کنارے ہے بستا

وہاں ایک ہے اور بھی ۔ پر نہ خواہر۔ خوشی سے گذرتے تھے جب دن ہمارے
تو کافی تھے بس اُسکے پہچاننے کو نظر میں تھے وُہ شوخ اُسکی اشارے
نہ تھے ناز و انداز تھی سادگی یہ ۔ نہ بیوجہ نفرت تھی اُلفت تھی ایسی
مجھے ڈر ہے ہوتا الم بھی ہے گہرا اُنتی کو کہ جس کی طبیعت ہو ہلکی
یہ کہنا تو اُس سے ۔ مری زندگی کی جو آخر تھی شب کیونکہ ہوگی سحر جب
تو آزاد ہو جائیگی جسم سے رُوح ۔ چھُٹ جائیگا جسم تکلیف سے سب
مجھے خواب آیا تھا ہُوں ساتھ اُس کے۔ ہے زرّیں شعاعوں سے سُورج چمکتا

پہاڑی جہاں پر ہے سرسبز گڑھ کی ۔ وُہ گڑھ جو کہ سرجو کنارے ہے بستا

بہی جاتی سرجو کی ہے نیل دھارا اَور ایسے ہیں سُر سارے کانوں میں آتے
کہ بس ہیں وُہی ٹھمریاں جو کہ ہم دونوں اُونچے سے بیٹھے سُرونمیں تھے گاتے
سماں بھی خموشی و تسکین کا ہے کہ ہے شام اَور وُہ ملے سُر ہمارے
پڑے گونجتے ہیں سُہانی ندی پر اَور اُوپر کی ڈھلواں پہاڑی میں سارے
وُہ چشمِ سیہ سے مجھے دیکھتی ہے ۔ گزرتے ہیں ہم بات کرتے ہوئے جب
بہت ایسے رستوں سے اُلفت ہے جن سے ۔ بہت ایسی راہوں سے جو یاد ہیں سب
اَور اُس کا بھروسے سے اَور نازکی سے پڑا ہاتھ میں ہاتھ میرے ہے اِس با
مگر اب نہ اُس سے مِلونگا میں گڑھ میں ۔ وُہ گڑھ جو کہ سرجو کنارے ہے بستا

یہ کہکر ہوئی اُس کی آواز دھیمی چھُٹا ہاتھ ساتھی کا ہاتھوں سے اُس کے
بھری آنکھ ۔ اور آہ کی ایک ٹھنڈی ۔ نہ نکلی کوئی بات پھر اُسکے مُنہ سے
جھُکا وُہ سپاہی اُٹھانے کو فوراً ۔ مگر شمع ہستی تھی گُل ہو چُکی واں
سپاہی تھا یُورپ کا پر جان اُسکی گئی آ کے اِک اجنبی مُلک میں یاں
اب آہستہ سے آسماں پر چڑھا ماہ ۔ اَور اُسنے دھیمی نگاہوں سے دیکھی
لڑائی کے میدان کی سُرخ ریتی کہ جو خُون آلُودہ لاشوں سے پُر تھی
نظارہ تھا پُر خوف لیکن اُسے بھی اُنہیں دھیمی نظروں سے وُہ دیکھتا تھا
کہ تھا دیکھتا جِس طرح دُور گڑھ کو ۔ وُہ گڑھ جو کہ سرجو کنارے ہے بستا

عیاشی کا انجام

سماں ڈر کا ہے اور وقتِ خموشی سحر جبکہ ہے رات سے آکے ملتی
اور اُس وقت چپکے سے آ ایک بھتنی کھڑی ہوتی عیاش کے پائنتی ہے

رُخ اُس کا ہے ہو جیسے صبحِ دسمبر لپیٹے ہوئے منہ پہ بادل کی چادر
اور اولے سے ہیں ہاتھ ٹھنڈے سراسر کہ پکڑے ہوئے اُسکا کالا کفن ہیں

یہی ہوگی ہر روئے زیبا کی صُورت گزر جائیگی عُمر کی جبکہ مُدت
یہی ہوگا شاہوں کا بھی تختِ راحت اُتارے گی جب موت تاجِ مُرصع

یہ عورت بھی مانندِ غنچہ کے بالکل پئے صافِ شبنم کے جو قطرۂ مُل
ابھی رُخ پہ کھلنے کو آیا ہی تھا گُل بس ایسا کہ ہو جیسے غنچہ شگفتہ

کہ کیڑا لگا وہ محبت کا اِس کو جوانی ہی میں چر گیا جسم کو جو
ہُوا زرد سارا گُلِ روئے نیکو اور آخر پڑا وقت سے پہلے مرنا

کہا۔ اُٹھ! اے معشوقہ تیری بُلاتی کہ جو قبر سے نصف شب کو ہے آتی
سُن اب رحم ہی سے کہ کیا ہے سُناتی محبت سے تو تُونے ناس اُسکا کھویا

یہ ہے وُہ اندھیرا ڈراناسماں جب — زباں یافتہ بھُوت شکوے کریں سب
نکلتے مزاروں سے مُردے بھی ہیں اب — کریں تاکہ عشاقِ فاسق سے شکوہ

ذرا سوچ عیاش اپنی خطا تُو — وُہ قولِ شکستہ وُہ عہدِ وفا تُو
مجھے پھیر دے میرا الھڑپنا تُو — مجھے پھیر دے میری عصمت وُہ پہلی

کیا تُو نے کیوں مجھ سے اقرارِ اُلفت — بنایا نہیں جب وُہ عہدِ محبت
تو کس طرح کہتا تھا میں خوبصورت — وُہ آنکھیں جنہیں تُو نے رونیکو چھوڑا

حسیں کیوں مرے رُخ کو تُو نے کہا تھا — حسیں تھی تو کیوں ترک مجھ کو کیا تھا
لیا تُو نے ناحق دلِ باکرہ تھا — جب اس دل کو کر کے شکستہ ہی چھوڑا

مرے لب کو کیوں تُو نے شیریں بتایا — گلابی سے جب اُسکو پیلا بنایا
یقیں کیوں تری جھُوٹی باتوں کا آیا — صد افسوس مجھ نوجواں ناسمجھ کو

وُہ چہرہ نہیں آہ اب خوبصورت — نہیں آہ لب کی وُہ اب سرخ رنگت
ہے بے نُور اب مَوت سے چشمِ حسرت — غرض ایک شے میں نہیں حُسن باقی

جلیں اب مرے بھجوکے کیڑے ہیں ہمسر — کفن کی ہے اب اوڑھنے کو یہ چادر

اسی طرح افسوس تا صبح محشر — میری راتیں سردی میں گزرینگی تنہا

وہ سن مرغ بولا یہ کہتا ہے چلدے — ہمیشہ کو بس یہ سلام آخری لے
کبھی تو مگر بے وفا دیکھ آکے — مزار اپنی معشوقۂ باوفا کا

پرند اب ہوئے نغمہ خواں اور سحر واں — ہوئی اشعۂ سرخ کے ساتھ خنداں
تھا عیاش زرد اور جسم اسکا لرزاں — اٹھا اور بس چیختا واں سے بھاگا

گیا دوڑتا سوئے شہر خموشاں — جہاں وہ حسینہ تھی مدفون بیچاری
گرا جاکے اک قطعۂ سبز پر واں — جہاں جسم تھا اسکا نظروں سے مخفی

یہاں تین بار اسکو آکر پکارا — یہاں تین ہی بار وہ خوب رویا
اور آخر کو منہ قبر پر رکھ کے اپنا — نہ بولا وہ پھر کچھ وہیں جان دیدی

لالہ تلوک چند صاحب محرُوم

تعارف

پنجاب کے سرحدی علاقہ میانوالی میں پیدا ہوکر جہاں کی زبان دہلی کی زبان سے اُتنی ہی مختلف ہے جتنی سیاہی سفیدی سے۔ نظم کہنا اور پھر اُس پر مُلک کے بہترین شاعروں سے خراجِ تحسین وصول کرنا امر ناممکن سا معلوم ہوتا ہے لیکن محرُوم نے اِسے ممکن کر دکھایا ہے۔ اِس باب میں یہ امر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ کہ آپ نے کسی اُستاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ کسی سے اصلاح نہیں لی لیکن بااین ہمہ آپکی شاعری میں وہ جذبہ، وہ رنگینی، وہ شیرینی اور وہ تخیُّل ہے۔ کہ پڑھنے والا جھُومنے لگ جاتا ہے۔ آپ کے کلام میں درد بُہت ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے کے سینہ میں ہوک سی اُٹھنے لگتی ہے جس نظارے کو لیتے ہیں نہائت صفائی و خوبصُورتی سے بیان کرتے ہیں۔ اپنی بیوی کی وفات حسرت آیات پر آپ نے چند نظمیں لکھی تھیں۔ اُن کو پڑھ کر آنکھوں سے بے اختیار آنسُو رواں ہو جاتے ہیں۔ محرُوم کی عُمر ابھی تیس سال سے متجاوز نہیں ہوئی۔ لیکن شاعری کی دور و نزدیک دُھوم مچ گئی ہے۔ آپ کی نظموں کے دو مجمُوعے چھپ چکے ہیں۔ تیسرا زیرِ طبع ہے۔

گوشۂ تنہائی

دُنیا میں بہت دوڑے راحت کے تمنائی
تسکین کی مگر صورت تجھ میں ہی نظر آئی
اے گوشۂ تنہائی!

بچتا نہیں دل جس کو لے جائیے میلوں میں
جُز تیرے کہاں راحت دُنیا کے جھمیلوں میں
اے گوشۂ تنہائی!

خلوت وہ تیری جس میں ہنگامۂ جلوت ہے
وحدت کا تیری غنچہ صد گلشنِ کثرت ہے
اے گوشۂ تنہائی!

ساماں ہیں بہم تجھ میں سب دل کی حضوری کے
محفل میں کہاں تیری صدمے ہیں مہجوری کے
اے گوشۂ تنہائی!

آزاد سے بالا ہے گو زیرِ زمیں ہے تُو
اربابِ قناعت کو فردوسِ بریں ہے تُو
اے گوشۂ تنہائی!

جنگل میں؟ پہاڑوں میں؟ تاریک گپھاؤں میں؟
مرغوب تریں ہے یا اشجار کی چھاؤں میں؟

اَے گوشۂ تنہائی!

پاتے ہیں جہاں تجھ کو دُنیا میں ترے شیدا
فی الفور وہیں اُن کے دُکھ درد ہیں ناپیدا

اَے گوشۂ تنہائی!

شاعر کہ مصوّر ہے فطرت کے نظاروں کا
ذرّوں میں ترے اُس کو جلوہ ہے ستاروں کا

اَے گوشۂ تنہائی!

بازارِ دو عالم میں جو جنس نہیں ملتی
حیرت ہے کہ انساں کو آکر ہے یہیں ملتی

اَے گوشۂ تنہائی!

دُنیا میں اگر کوئی منزلگہِ عقبےٰ ہے
وُہ تیرا ہی مسکن ہے وُہ تیرا ہی ملجا ہے

اَے گوشۂ تنہائی!

ہر ایک تگ و دَو کی ہے' آخرِ کار' آخر
گر تجھ سے یہاں بھاگے ہے کُنجِ مزار آخر

اَے گوشۂ تنہائی!

خواہاں ہے دِل وجاں سے محرُوم حزیں تیرا
کاش! اِس کو دِلِ ناداں ہونے دے مکیں تیرا

اَے گوشۂ تنہائی!

بچّے کی مُسکراہٹ

۲۴

نہ ہجوم آرزُو ہے نہ وُہ حسرتوں کا جمگھٹ
وُہ نقوشِ داغِ حرماں ہُوئے دِل سے محو جھٹ پٹ
کہ اُنہیں مِٹا گئی ہے
تِری ایک مُسکراہٹ

تِری ایک مُسکراہٹ ہے دوا ہزار اَلَم کی
تجھے دیکھ کر نہ دیکھے دلِ زار شکلِ غم کی
مِرے دِل کو بھا گئی ہے
تِری ایک مُسکراہٹ

رُخِ یاس کو چھپائے اثرِ اُمید جیسے
شبِ تار پر ہو غالب سحرِ سعید جیسے
یُونہی دِل پہ چھا گئی ہے
تِری ایک مُسکراہٹ!

نہ قمر کے نُور میں ہے نہ سحر کی روشنی میں
نہ شفق کے رنگ میں ہے نہ ہے پھُول کی ہنسی میں
جو سماں دِکھا گئی ہے
تِری ایک مُسکراہٹ

کوئی چشمہ مسّرت تِرا دِل ہے طفلِ ناداں

یہ تبسم پیاپے ہے۔ برنگِ موج رقصاں
مجھے خود بتا گئی ہے
تری ایک مسکراہٹ

تو گناہ سے بری ہے یہ ہے وجہ شادمانی
وہ تری صفائے دل ہے کہ ہو آئینہ بھی پانی
یہ مجھے بتا گئی ہے
تری ایک مسکراہٹ!

وقتِ سحر

ستاروں کا گلزار وقفِ خزاں ہے بہارِ سحر سے جہاں شادماں ہے
زمیں ہمسرِ ساحتِ گلستاں ہے شفق سے فلک تختۂ ارغواں ہے
مسرت سے بریز سارا جہاں ہے
سہانا سہانا سحر کا سماں ہے

نہ تھا خوابِ غفلت ذرا موت سے کم جہاں پر تھا شہرِ خموشاں کا عالم
نسیمِ سحر بسکہ تھی عیسوی دم دوبارہ ہوا ایک بیک زندہ عالم
نئے سر سے پھر آ گئی سب میں جاں ہے
سہانا سہانا سحر کا سماں ہے

نسیمِ سحر دل کشا روح پرور شمیمِ گلِ تر سے عالم معطر

پرندوں کے جاں بخش نغمے ہوا پر وہ تانیں کہ ہر آن جن سے سراسر
سرورِ مئے شادمانی عیاں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے

پیامِ مُسرت صبا لے کے آئی ہنسے پھول ہر اِک کلی مُسکرائی
شگوفے ہُوئے مائلِ لب کُشائی طیورِ چمن محوِ رنگیں نوائی
ہجومِ طرب باغ کے درمیاں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے

چمکتا ہے سُورج دَمکتی ہے دُنیا لپکتی ہیں موجیں جھمکتے ہیں دریا
چٹکتی ہیں کلیاں لہکتا ہے سبزہ مہکتا ہے گُلزارِ عالم سراپا
چہکتی اُڑی بُلبُلِ نغمہ خواں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے

وُہ ہَل چَل مچی شہر و دشت و جبل میں تموّج سا پیدا ہے جل اور تھل میں
چمک اُٹھے شبنم کے قطرے کنول میں نئی تازگی آ گئی پھول پھل میں
رگِ دہر میں خُونِ فرحت رواں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے

سُنہری ہُوئی کوہساروں کی رنگت رُپہلی ہُوئی آبشاروں کی رنگت
غضب ڈھا گئی لالہ زاروں کی رنگت ہے اِک برگ میں سو بہاروں کی رنگت
زمینِ چمن عکسِ باغِ جناں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے

فلکِ اخضری ہے جام مرا

تھوڑی سی شرابِ خندۂ گُل رنگین جس سے کہ ہو تخیّل
پیمانۂ برگِ یاسمن میں یا ساغرِ لالۂ چمن میں
جس سے کہ خبر نہ ہو دہاں کو کر لیجئے تازہ کامِ جاں کو

صہبائے شفق کے گھونٹ دو گھونٹ پی جائیے اور تر نہ ہوں ہونٹ
وُہ بادۂ خُوشگوارِ لعلیں عالم نظر آئے جس سے رنگیں

یا صُبح کی وُہ مئے نظارا ہو جس سے چمک میں ماند تارا
چُپ چاپ خموشئِ سحر میں پی جائیے بس نظرِ نظر میں

خمخانۂ اخضرِ کہن کی جسمیں ہو چمک دمک کرن کی!
جامِ مہتاب سے چھلک کر چھینٹے چھینٹے گرے زمین پر
ہر مست بقدرِ ظرف پی لے اور لُطفِ سُرورِ بیخودی لے
محرُوم بھی بہرہ یاب ہوجائے مستِ مئے فکر تاب ہوجائے

او ساقئِ بزمِ میگُساری
کافی ہے مجھے یہ بادہ خواری

چڑیا کی زاری

اَے بد نہاد لڑکے! اَے نابکار لڑکے!
یہ کیا کیا؟ خُدا کی تجھ پر ہو مار لڑکے!

نازل غضب خُدا کا تجھ پر اِسی گھڑی ہو
اَور مَوت لیکے خنجر سر پر ترے کھڑی ہو!

ظالم! خُدا کرے تو بچپن میں جان کھوئے
میری طرح سے تیری ماں زار زار روئے!

بے رحم! کیا بگاڑا اِن بے پروں نے تیرا
نُقصان کیا کِیا تھا۔ اِن بے گھروں نے تیرا

مَوجِ فنا میں اِن کو تُونے بہا دیا کیُوں؟
اِن کا نشانِ ہستی ظالم مِٹا دیا کیوں؟

اب تک نہ تھے اُنہوں نے سفاک! پر سنبھالے
میرے غریب بے پر! میرے وُہ بھولے بھالے!

کِن کِن مصیبتوں سے تھا آشیاں بنایا
لا لاکے تِنکا تِنکا تھا گھر یہاں بنایا

وُہ گھر کہیں پڑا ہے۔ بچّے کہیں پڑے ہیں!
دُور از مکان وِیراں بیکس مکیں پڑے ہیں!

وُہ میرے پیارے بچّے! لختِ جگر وُہ میرے!

چشم و چراغ میرے! نُورِ بصر وُہ میرے!
وُہ میرا گھر میں آنا! اِن کا وُہ چہچہانا
اِن کا وُہ لاڈ کرنا! میرا وُہ صدقے جانا

کِن کِن دُکھوں سے ہائے! بچّوں کو میں نے پالا
پڑنا تھا وائے قسمت! اِس پُر جفا سے پالا
مٹّی پہ ہائے ہائے! بے جاں پڑے ہُوئے ہیں
کِس نیند میں یہ میرے ناداں پڑے ہوئے ہیں

اَے میرے پیارے بچّو! امّاں تُمہاری آئی
چُن چُن کے دانہ دانہ خاطر تُمہاری لائی
میں نے سحر سے تُم کو پانی نہیں پلایا
اُٹھو کہ اب تُمہارے اُٹھنے کا وقت آیا

خاموش کیُوں پڑے ہو؟ مِنقار اپنی کھولو
کیُوں رُوٹھتے ہو مجھ سے؟ ہاں کچھ تو مُنہ سے بولو

افسوس نسلِ اِنساں! تجھ میں وفا نہیں ہے
کہتے ہیں اُنس جِسکو تجھ میں ذرا نہیں ہے
تیغِ جفا سدا ہے تیری میاں سے باہر
جور و ستم ہیں تیرے حدِّ بیاں سے باہر

ہمسائیگی میں تیری آکر ہوئے مکیں تھے
لچھّن تیرے مگر ہم کچھ جانتے نہیں تھے

سختی تری ستمگر! کتنی ہے بے کسوں پر
یہ جبر بے تحاشا! یہ جور بے بسوں پر
غدّار! بیوفائی تیری سرشت میں ہے
تیرا یہی وتیرہ دُنیائے زشت میں ہے
تُجھ میں کہاں محبّت؟ جسکا ہے تُجھ کو دعوے
تُجھ میں کہاں صداقت؟ جس پر ہے ناز بےجا
نزدیک نسلِ انساں ہرگز کوئی نہ آئے!
اپنے جگر پہ زخم تیغِ ستم نہ کھائے!
اس میل جول کا گر انجام جانتی مَیں
کم بخت دِل کا کہنا ہرگز نہ مانتی مَیں
جنگل میں جا کے اپنا مَیں آشیاں بناتی
شاخِ شجر پہ خس کا چھوٹا مکاں بناتی
رہتی ہنسی خوشی سے بچّوں کو پالتی مَیں
خطرے میں اپنی جاں کو ہرگز نہ ڈالتی مَیں
مَیں اِن کو لا کھلاتی جنگل سے جا کے دانے
جب تک نہیں ہوئے تھے کم سِن مرے سیانے
مجھ پر ستم ہُوا ہے۔ اے جسم وجاں کے مالِک!
اے دادگر زمیں کے! اے آسماں کے مالِک!
مَیں بےزباں ہُوں کرتی فریاد تیرے آگے

کہتی ہوں اپنے غم کی رُوداد تیرے آگے
اب کس طرف کو جاؤں میں بے زبان چڑیا!
میں غم کی ماری چڑیا. میں خستہ جان چڑیا!

کولہُو کا بَیل

ریٹ خود بھاری ہے۔ پھر اسپہ یہ تیمر کیسا؟ جوَر پر جوَر ستم کیش! جفا گر! کیسا؟
پٹی آنکھوں پہ مری۔ دیکھنے والو! کیسی؟ ہائے اے گردشِ تقدیر! یہ چکر کیسا؟
کس خطا پر یہ رلاتا ہے ہمیں مٹی میں آسماں ہم سے ہوا آہ! مکدر کیسا؟
بدلے کس دن کے لئے بیل بنا کر ہم کو!
اسکو مل جائیگا کیا اتنا ستا کر ہم کو!

ختم ہونے نہیں پاتا وہ سفر ہے اپنا ہم چلے جاتے ہیں دن رات۔ جگر ہے اپنا
کاش! اسی راہ میں آپڑتا عدم کا رستہ اُف! افسوس! نصیبا ہی مگر ہے اپنا
ہم جہاں ٹھیرے ذرا بیٹھ پہ چابکسی پڑی دم کہاں لیتے ہیں۔ اسمیں بھی ضرر ہے اپنا
تیل ٹپکے ہے پڑا کولہو سے قطرہ قطرہ!
خشک ہوتا ہے ادھر لوہو سے قطرہ قطرہ!

مرغزاروں میں نہ جاکر کبھی سبزہ دیکھا بہتے دریا کا نہ سرسبز کنارہ دیکھا
اپنے ہم جنسوں سے جاکر نہ ملے دم بھر کو کھیل دیکھی نہ کوئی ہم نے تماشا دیکھا
چار دیواری ہی تیلی کے گھر کی دیکھی اور اس قیدِ دوامی میں بھلا کیا دیکھا

بیل کولھو کے بنائے گئے تقدیر سے ہم
نِکلے گردش سے نہ ہرگز کسی تدبیر سے ہم

تن بہ تقدیر یہی کام کئے جاتے ہیں　　منتظر موت کے مر مر کے جئے جاتے ہیں
لختِ دِل کھانے کو مِلتا ہے سو کھا لیتے ہیں　　خُون جب تک کہ جگر میں ہے پئے جاتے ہیں
داورِ روزِ قیامت کے لئے ہم دِل پر　　داغ بیمہریٔ اِنساں کے لئے جاتے ہیں

کاش! ٹل جائے کہیں سر سے عذابِ ہستی!
ہائے کب تک رہیں ہم زیرِ عتابِ ہستی!

کام لیتے ہیں مگر کھانے کو کیا دیتے ہیں　　کیسی بیدردی سے خدمت کا صِلہ دیتے ہیں
دشمنِ اہلِ وفا ہیں یہ کدُورت والے　　خاک میں رنگِ محبت کو مِلا دیتے ہیں
نیکے آجاتے ہیں چھریاں دمِ آخر سر پر　　حقِ خِدمت کو بہت جلد بُھلا دیتے ہیں

کیسے ظالم ہیں نہ کچھ مُزد نہ مِنّت یا رب!
کوئی ایسوں کی کرے کس لئے خدمت یا رب؟

اے جبل! آکہ ہے اِک تیرا سہارا ہم کو　　تیری آنکھوں سے ہے ڈھارس کا اشارا ہم کو
ہائے تقدیر تھی کیا دشمنِ جانی اپنی　　زندگی دے کے جفا کار نے مارا ہم کو
قیدِ ہستی سے رہائی کا ہو چارا کوئی　　اب سے بیکار نہ کچھ گھاس نہ چارا ہم کو

اے خُدا مُلکِ عدم میں نہ ہو کولھو کوئی!
ہم کو مِل جائے نہ پھر آہ جفا جُو کوئی!

مچھلی کی بیتابی

میری خطا! جو تجھ سے کروں التجائے رحم ظالم! تو وہ نہیں کہ تجھے مجھ پہ آئے رحم
تھے لوگ رحم دل۔ کبھی وہ بھی زمانہ تھا اُٹھ ہی گیا ہے اب تو زمانے سے ہائے رحم
دل میں ہے تیرے جور و جفا مہر کے عوض آنکھوں میں تیری قہر ہے ظالم بجائے رحم
ہے دام تیرے دوش پہ اور ہاتھ میں چھری صورت یہ ہو تو کس طرح نزدیک آئے رحم
سینے میں دل کہاں ہے ترے لخت سنگ ہے ناواقفِ کرم ہے تُو نا آشنائے رحم

ترپا نہ اب مجھے۔ مرا قصہ تمام کر!
قدرت نے اختیار دیا قتلِ عام کر!

مسرور ہو نہ دیکھ کے بیتابیاں مری سر پنجۂ عذاب میں ظالم! ہے جاں مری
اے بدگماں! نہ رکھ مجھے الجھا کے دام میں میں نیم جاں ہوں اب وہ تڑپ ہے کہاں مری
میں رہنے والی آہ! تھی دُنیائے آب کی جلتی ہیں گرم ریت پہ اب پسلیاں مری
کیوں کر سناؤں حال دلِ بیقرار کا تابِ فغاں مجھے ہے نہ گویا زباں مری
ہو دل میں درد اور سُنے گوشِ دل سے تو صد محشرِ فغاں ہیں یہ خاموشیاں مری

تقدیر نے اجازتِ فریاد ہی نہ دی!
مجھ کو زبانِ شکوہ بیداد ہی نہ دی!

گہوارہ مجھ سے چھوٹ گیا موجِ آب کا باعث نہ پوچھ مجھ سے مرے اضطراب کا
وہ نرم نرم کائی وہ مخمل کا فرشِ سبز چھوٹا سا آہ! خیمۂ آبی حباب کا
خشکی پہ آکے آہ جھلستا ہے تن مرا پیشِ نظر ہے چار سُو عالم سراب کا

ڈالا مجھے بہشت سے دوزخ میں یک بیک — اے آسماں! سبب کوئی اِس انقلاب کا
آپ رواں! نہ رو۔ مری تقدیر تھی یہی — گرداب غم نہ کر تو مرے پیچ و تاب کا

روتے ہیں میرے غم میں رفیقانِ زیرآب!
بزمِ عزا ہے آہ! شبستانِ زیرآب!

حیرت میں ہوں نہنگِ قضا ہے کہ آدمی؟ — جاندار پر ہیں دانت۔ بلا ہے کہ آدمی؟
پیچھا کیا مرا ملک الموت کی طرح — پیغامِ مرگ مجھ کو ملا ہے کہ آدمی؟
شفقت بھری یہ شکل۔ یہ کرتوت ہائے ہائے! — ہنگامۂ خموشِ جفا ہے کہ آدمی؟
اُف تُف! چھری بغل میں ہے اور منہ میں رام رام — مجموعۂ فریب و ریا ہے کہ آدمی؟
جانیں قدم قدم پہ مسلتا ہے زیرِ پا — یا رب یہ کوئی فتنہ اُٹھا ہے کہ آدمی؟

سو سو شرارتیں ہیں جہاں پر بشر ہے ایک
عنقا ہے خیر۔ جزوِ بشر آج شر ہے ایک!

مخلوق ہم بھی ہیں اُسی پروردگار کی — جس کے کرم پہ ہے نظرِ اُمیدوار کی
انصاف پر اُسی کے بھروسا ہمیں بھی ہے — میزاں ہے جس کے ہاتھ میں روزِ شمار کی
کب تک بھلا چھپائیگی خون بے گناہ کا — نیرنگیاں یہ گردشِ لیل و نہار کی
دکھلاؤنگی وہاں دلِ سوزاں کا داغ داغ — مجھ کو قسم ہے اپنے تنِ داغدار کی
ہے شکر کی جگہ کہ وہ دن بھی قریب ہے — شاکی بہت ہُوں میں ستمِ روزگار کی

کیا جو خدا ترا ہے وہ میرا خدا نہیں؟
فریاد رس وہ "ماہیِ بے آب" کا نہیں؟
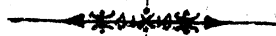
سبزۂ نو

ناداں! پئے تماشہ سر تو نکال بیٹھا ... لیکن تو بارِ ہستی گردن پہ ڈال بیٹھا
یہ بار وُہ ہے رو رو جسکو اُٹھائیگا تُو ... یہ خار وُہ ہے جس سے دامن چھڑائیگا تُو
صد کوہِ درد ہوگی اِس بوجھ کی گرانی ... بارِ گراں تریں ہے دُنیا میں زندگانی
اِس بوجھ کو اُٹھا کر کتنے ہی دُکھ بھریگا ... یہ بوجھ وُہ ہے جسکے نیچے تُو دب مریگا

آخر عذابِ ہستی سر سے ترے ٹلیگا!
جس وقت کوئی تجھ کو پامال کر چلیگا!

ارمان دیدِ گُل ہے؟ دھوکا ہُوا ہے تجھ کو ... لیکر عدم سے آئی تیری قضا ہے تجھ کو
رُخ پر ترے پسینہ گرمئ شوق کا ہے ... اے سبزہ! جسکو شبنم لوگوں نے کہدیا ہے
محرومِ زار تجھ سے رہ رہ کے کہہ رہا ہے ... نو واردِ گلستاں! دھوکا تجھے ہُوا ہے

ہے خندۂ گُلِ تر برقِ فنا کا جلوہ
آیا نظر جو تجھ کو غافل! بقا کا جلوہ

حیرت کو تیری ہونگے یاں انقلاب لاکھوں ... ہستی کی رات میں تو دیکھیگا خواب لاکھوں
ناز و ادا سے تیرا گلشن میں لہلہانا ... اور ذوقِ بیخودی میں یہ لوٹ لوٹ جانا
لوٹے ہے تُو زمیں پر پیکر شرابِ اُلفت ... مستی شکن ملیگا تجھ کو جوابِ اُلفت
پڑ جائیگا چمن میں جس وقت رنگ پھیکا ... مجھ کو تو غم یہی ہے۔ کیا حال ہو کسی کا
بادِ صبا چمن سے کر جائیگی کنارا ... ڈوبیں گے بحرِ غم میں صد برگ اور ہزارا
ہو جائیگا فضا سے ابرِ بہار رُخصت ... بادِ خزاں چلے گی۔ برسا کریگی حسرت

آکر قضا ہنسیگی جب گُل کی جا چمن میں
اے سبزہ! خاک اُڑیگی بُلبُل کی جا چمن میں

ہر اِک کا مُدعا ہے دُنیا میں شادمانی تیری طرح ہے عالم جویائے کامرانی
گلہائے لُطفِ دُنیا ہر چند چیدنی ہیں نظارہ ہائے دُنیا دلکش ہیں دیدنی ہیں

لیکن غضب تو یہ ہے اِن میں بقا نہیں ہے
افسوس دِل لگی کا کچھ بھی مزا نہیں ہے

ننھا سا تُو کسی کا اِک نخلِ آرزو ہے پھلنے کی آرزو پر پھوٹا کنارِ جو ہے
لیکن یہ تیرا سودا سودائے خام ہوگا پھلنے سے پہلے تیرا قصّہ تمام ہوگا

جس خاک سے اُگا ہے اُس خاک میں ملیگا
گُل تیری آرزو کا اگلے برس کھلے گا!

پنڈت میلارام صاحب وفا

تعارف

وفا۔ دیو کی ضلع سیالکوٹ میں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ یہ موضع لوازمات تہذیب سے چاروں طرف سے سولہ سولہ کوس دُور ہے طبیعت بہت سادہ ہے۔ اور دیکھنے سے گمان تک نہیں ہوتا۔ کہ یہ شخص کبھی شعر کہنا تو درکنار شعر سمجھ بھی سکتا ہوگا۔ لیکن آپ کے کلام میں وہ رنگینی وہ چاشنی وہ اثر ہے۔ کہ دیکھ کر آدمی سر مارنے لگ جاتا ہے۔ پنجاب میں ڈاکٹر اقبال کے بعد وفا کی برابری کرنے والا کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے۔ آپ کی عمر ابھی چھوٹی ہی ہے۔ لیکن میدانِ شاعری میں آپ کی دُھوم پڑ گئی ہے۔ آپ پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی کے شاگردوں سے ہیں۔ کلام میں تاثیر پائی جاتی ہے۔ اور اکثر مقامات پر ایسی بلندی تک جا پہنچے ہیں۔ کہ اساتذہ کے کلام کا دھوکا لگ جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے۔ کہ ابھی تک لوگوں نے وفا کی وہ قدر نہیں کی۔ جس کے وہ مستحق ہیں۔ لیکن قدر ہو یا نہ ہو اس سے اُن کی شاعری میں فرق نہیں آتا۔ وہ ایک دن دوست دشمن دونوں سے زبردستی خراجِ تحسین ادا کرائے گی۔

کسان

جب زمانے میں عمل ہوتا ہے پچھلی رات کا
بے خبر سوتا ہے ذرّہ ذرّہ موجودات کا

کشورِ عالم پہ ہوتی ہے حکومت نیند کی
زیر کر لیتی ہے دنیا بھر کو طاقت نیند کی

لیتے ہیں لطفِ نظارہ نیند کی وادی میں سب
پہنچے ہوئے ہیں اسی خاموش آبادی میں سب

ہوتی ہے ساری خدائی دوشِ بر دوشِ سکوت
شورشِ ہنگامۂ ہستی ہم آغوشِ سکوت

جنبشِ موجِ ہوا دیتی ہے پیغامِ سکوں
دوڑتے ہیں تارِ خاموشی میں احکامِ سکوں

برف بن جاتا ہے جب آبِ رواں دریاؤں میں
اور ہو جاتی ہیں ساکن آندھیاں صحراؤں میں

بند ہو جاتا ہے سطحِ بحر پر موجوں کا شور
دشت میں رہتا نہیں جنّات کی فوجوں کا شور

چرخ پر تاروں کی ہو جاتی ہے جب رفتار سست
چلتی ہے جب نبضِ بیمارِ فراقِ یار سست

جبکہ پڑ جاتی ہے مدھم گردشِ افلاک بھی
اونگھتی ہے پے بہ پے نو بیوۂ غمناک بھی

طفلِ نو زائیدہ کی ماں کو خبر ہوتی نہیں
طبعِ شاعر کو تلاشِ شعرِ تر ہوتی نہیں

پیٹھ کر لیتا ہے سیدھی زاہدِ شب باش بھی
اور مندھے جاتے ہیں پیہم دیدۂ غفّاش بھی

درد کے ماروں کو بھی مسحور کر دیتی ہے نیند
سوزشِ زخمِ جگر کا فور کر دیتی ہے نیند

کوئی پھرتا ہے بہ احوالِ پریشاں خواب میں
اور کرتا ہے کوئی سیرِ پرستاں خواب میں

الغرض جامد طرف کا مل سکوں ہوتا ہے جب
منجمد خوابیدہ شریانوں میں خوں ہوتا ہے جب

آبِ ساکن آسمانِ نیلگوں ہوتا ہے جب
بے صدا ہنگامۂ دنیائے دوں ہوتا ہے جب

ہوتا ہے جب شہرِ خاموشاں جہانِ زندگی

رُوئے عالم پر نہیں ملتا نشانِ زندگی

لے کے عین اسوقت اُٹھتا ہے خدا کا نام تُو   یعنی پیارا جان سے رکھتا ہے اپنا کام تُو
ملتوی کرتا ہے کل پر راحت و آرام تُو   کھیت میں جاتا ہے پی کر چھاچھ کا اِک جام تُو

ہل چلاتا ہے وہاں اِک رنگ میں گاتا ہُوا
گرد و پیش اپنے سرُور و کیف برساتا ہُوا

توڑ دیتی ہیں تری تانیں سکوتِ شب کا تار   بربطِ گیتی میں ہو جاتے ہیں نغمے بیقرار
گونجتی ہے دُور تک تیری صدائے خوشگوار   باغ میں۔ آوے یہ ٹیلوں سے پرے۔ نالے کے پار

طاری ہو جاتا ہے عالم وجد کا چاروں طرف
اور بندھ جاتی ہے مرزا کی ہوا چاروں طرف

دوپہر تک ہل چلاتا ہے کڑکتی دُھوپ میں   کھیت میں بارہ بجاتا ہے کڑکتی دُھوپ میں
محنتِ بیجد اُٹھاتا ہے کڑکتی دُھوپ میں   خُوب مٹی کو کماتا ہے کڑکتی دُھوپ میں

ملتا ہے پھر ثمرۂ کشتِ عمل آخر تجھے
دیتی ہے قُدرت تری محنت کا پھل آخر تجھے

ہوتا ہے اسوقت حاصل تیرے دِل کو وہ سرُور   شادمانی کا جھلکتا ہے ترے چہرے پہ نُور
حِصّہ جاتا ہے کسانی کا تری نزدیک و دور   بہرہ ور ہوتے ہیں موش و مردم و مور و طیُور

بخل یُوں خیرات دینے میں بھی تو کرتا نہیں
دستِ سائل کو کبھی بے آبرُو کرتا نہیں

آہ! وہ منعم جو ہیں تجھ سے بظاہر بے نیاز   تجھ میں پوشیدہ ہے انکی دولت و ثروت کا راز
تیری پیداوار سے لد لد کے چلتے ہیں جہاز   تیری محنت سے اُٹھاتے ہیں منافع سٹہ باز

سچ یہ ہے معمور سرکاری خزانے تجھ سے ہیں
اور ساہوکار کی کوٹھی میں دانے تجھ سے ہیں

آبیاری کو ترے کھیتوں کی ہے ابرِ بہار　　تیری فصلوں کے پکانے کو ہے مہرِ نور بار
پنکھا کرنے کے لئے تجھ کو ہوائے خوشگوار　　تیری خاطر ہیں یہ ساری نعمتیں اے دستدا

تو ہے خلقت پر خدا کی مہربانی کا سبب
ورنہ ہیں بنئے مہاجن تو گرانی کا سبب

شامِ غربت

۳۰

الوداع اے وقتِ مغرب کی شعاعِ آخری　　انعقادِ بزمِ شب کی اطلاعِ آخری
ہوتی جاتی ہے ہم آغوشِ سوادِ شام تو　　ہے مگر خوکردۂ تاریکیٔ ایام تو
آہ تو آسودۂ دامانِ شب ہونیکو ہے　　یا اسیرِ کلبۂ احزانِ شب ہونیکو ہے
یوں نہ برباد اے سبیلِ اجتماعِ جلوہ ہو　　جانئے دنیا میں گرمِ اختراعِ جلوہ ہو

اُف یہ جاں پرور خرامِ دلربایانہ ترا　　دامنِ دشت وجبل پر رقصِ مستانہ ترا
رقص کرتی تو اترتی ہے دَر و دیوار سے　　رقص کے انداز پیدا ہیں تری رفتار سے
رقص میں ہیں جانور تیری ادائے رقص پر　　رقص کرتے ہیں شجر تیری ہوائے رقص پر

اب کہ دونوں وقت آپسمیں گلے ملنے کو ہیں　　یعنی باہم صبح کے بچھڑے ہوئے ملنے کو ہیں

طائر اُڑنے کو پرِ پرواز پھیلانے لگے
اپنے اپنے آشیانوں کی طرف جانے لگے

قلبِ زارم را سپردِ شامِ غربت کردائی
با ملالِ آشنائے رنجِ قربت کردائی

چادرِ شب تان کر خورشیدِ خاور سو چلا
وادی و کہسار و صحرا میں اندھیرا ہو چلا

چھا رہی ہے غم کی تاریکی دلِ صد پارہ پر
پھرتی جاتی ہے سیاہی دامنِ نظارہ پر

آہ میں غربت نصیب اور یادِ یارانِ وطن
وہ میرے غمخوار میرے غمگسارانِ وطن

کِسکو یاد آیا میں کیسی ہچکیاں آنے لگیں
کثرتِ رقت سے آنکھیں اشک برسانے لگیں

موجزن ہے جوشِ طوفاں بحرِ محسوسات میں
اِک تلاطم سا بپا ہے قلزمِ جذبات میں

شب جو یہ شامِ مصیبت ہوگی میرے واسطے
صُبح بھی صُبحِ قیامت ہوگی میرے واسطے

میں ہُوں اِک بے بہرۂ لطفِ بہارِ زندگی
نذرِ غربت ہیں میرے لیل و نہارِ زندگی

زندگی نام آمد و رفتِ نفس کا ہے فقط
ورنہ جینے کا سہارا یہ تمنا ہے فقط

کر سکوں غربت میں کوئی کارِ بہبودِ وطن
کاشکے میرا زیاں ہو مضمرِ سودِ وطن

بسنت کی آمد

پھر نظر آتی ہیں سبزے کی فضائیں دُور تک
اور خوشبو سے مہکتی ہیں ہوائیں دُور تک

جاتی ہیں قمری و بلبل کی صدائیں دُور تک
نیچے اُوپر۔ آگے پیچھے دہنے بائیں دُور تک

ہیں ترنم ریز یکسر شاخ و برگ و بار آج

بن گیا ہے ریشہ ریشہ تارِ موسیقار آج

گلشنوں میں ہیں عروسانِ بہار آراستہ گلبن و نخل و نہال و شاخسار آراستہ
سبزہ و گل سے ہیں دشت و کوہسار آراستہ ہو گیا سارا جہاں آئینہ وار آراستہ

ہر لبِ جو پر ہیں یوں سروِ خراماں سینکڑوں
گویا شیشے میں اُتر آئی ہیں پریاں سینکڑوں

پھر بسنت آئی ہوا میں پھر کلنگ اُڑنے لگے آسماں پر وولے بن کر پتنگ اُڑنے لگے
شعلے توپوں سے سرِ میدانِ جنگ اُڑنے لگے صورتِ کافور سنگینوں سے زنگ اُڑنے لگے

از سرِ نو طبعِ شاعر میں روانی آ گئی
بلکہ پیرِ سالخوردہ پر جوانی آ گئی

دہر سے معدوم جاڑے کے نشاں ہونے لگے ہر طرف آثارِ سرگرمی عیاں ہونے لگے
جادہ پیمائے منازل کارواں ہونے لگے منجمد دریاؤں کے پانی رواں ہونے لگے

پتھروں میں جوشِ تاثیرِ نمو پیدا ہوا
ہر رگِ افسردہ میں تازہ لہو پیدا ہوا

اے وفاؔ کھلنے ہیں تجھ پر آج کیا کیا راز دیکھ چل چمن میں بلبل و گل کے نیاز و ناز دیکھ
جنبشِ موجِ نسیمِ صبح کا اعجاز دیکھ طائرِ بے بال و پر کی حسرتِ پرواز دیکھ

چھوڑ غفلت آ در مہِ گرمجوشی تو بھی ہو
عرصۂ ہستی میں گرمِ تازہ کوشی تو بھی ہو

رفتارِ زمانہ

تگ و تاز کی ہے تمنّا مجھے یہ طاقت نہیں لیکن اصلا مجھے
پھرا تُو ہی کہسار و صحرا مجھے چلا چل اُٹھاتا گراتا مجھے
بہے جا۔ بہائے لئے جا مجھے

جہاں کلفت و غم سے معمور ہے خوشی سات پردوں میں مستور ہے
مَیں درماندہ منزل بہت دُور ہے بس اب پائے ہمّت بھی معذور ہے
بہے جا۔ بہائے لئے جا مجھے

ہے درپیش خوف و خطر جا بجا پس و پیش۔ زیر و زبر جا بجا
نظر آ رہے ہیں بھنور جا بجا کروں کس طرح سے حذر جا بجا
بہے جا۔ بہائے لئے جا مجھے

فراغت یہاں ایک ساعت نہیں کہ بیمار پڑنے کی فرصت نہیں
ٹھہرنے کی دم بھر کو مُہلت نہیں کوئی صورتِ اِستقامت نہیں
بہے جا۔ بہائے لئے جا مجھے

توئی رہنما شاہ و درویش را نکوکار را ہم بداندیش را
سپردم بہ تو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را
بہے جا۔ بہائے لئے جا مجھے

سوسائٹی

وہ موسمِ بہار - وُہ دامن پہاڑ کا　　وُہ آسماں پہ نِکلا ہُوا چودھویں کا چاند
گلگشت کرتی چاندنی پھرتی ہے جا بجا　　فرشِ زمیں پہ اُترا ہے عرشِ بریں کا چاند

سبزہ ہے اَور اس پہ گُلِ نوبہار بھی　　جن سے مہک رہی ہے ہَوا دُور دُور تک
تھوڑے سے فاصلے پہ ہے اِک آبشار بھی　　پانی کی گونجتی ہے صدا دُور دُور تک

دو نوجوان بیٹھے ہُوئے محوِ گفتگو　　معلوم ہوتا ہے کوئی آفت رسیدہ ہیں
کرتے ہیں ہمدگر وہ غمِ مرگِ آرزُو　　ظاہر ہے صاف گردشِ آفاق دیدہ ہیں

معلُوم کرنا راز کسی کا ہے نا روا　　کیا کہہ رہے ہیں وُہ ہمیں اِس سے غرض نہیں
دُنیا میں غمزدہ کا سہارا ہے غمزدہ　　یعنی جو بے علاج ہو غم وہ مرض نہیں

ممکن نہیں نکالنا دِل کی بھڑاس کا　　گر آدمی کا مونسِ جاں آدمی نہ ہو
اِنسان ایک پُتلا ہے اُمّید و یاس کا　　جینا ہے موت گر کوئی سوسائٹی نہ ہو

ہندوستانی شہیدانِ جنگ سے خطاب

اَے کشتگانِ شوقِ شہادت صد آفریں
تُم نے کیا اضافہ بزرگوں کی شان پر
تُم نے بڑھائی ہند کی عزت صد آفریں
راہِ وفا میں کھیل گئے اپنی جان پر

بے شک تُمہاری شان ہے شانِ دلاوری
تُم سے ہُوا بُلند شجاعت کا مرتبہ
تُم ہی تو ہو مکینِ مکانِ دلاوری
پایا تُمہیں نے مرکے شہادت کا مرتبہ

مر مر کے تُم نے معرکۂ کارزار میں
زندہ کیا ہے نام شجاعانِ ہند کا
تُم میں سے ایک ایک تھا یکتا ہزار میں
پایا خطاب تُم نے مُحبانِ ہند کا

پُہنچی تمہاری فوج جو مُلکِ فرنگ میں
نقشہ بدل گیا وہیں میدانِ جنگ کا
ہاں تم نے بھنگ ڈالدی دشمن کے رنگ میں
مُنہ آن میں پھرا دیا توپ و تفنگ کا

یورپ میں تیغِ ہند کے جوہر دکھا دئے
تُم نے بہادری میں بڑا نام پا لیا
لشکر عدو کے پیچھے کی جانب بھگا دئے
تہذیب کو تباہی سے تُم نے بچا لیا

فی الواقعہ لہو میں تُمہارے بُجھا ہُوا
ایک ایک ذرہ خاکِ عراق و عرب کا ہے
مجبور تُم نے صلح پہ ٹرکی کو کر دیا
تُم کو ہی فخر فتحِ دمشق و حلب کا ہے

تھے موت کا پیام سرِ کارزار تم — سفاک دشمنوں پہ قضا بن کے جا پڑے
رکھتے نہ تھے خیال یمین و یسار تم — کر دی وہیں صفائی جہاں تن کے جا پڑے

لڑتے تھے رکھ کے دل میں جو دن اور رات تم — اب پوری ہو گئی وہ تمہاری امیدِ فتح
اے کاش آج ہوتے بقیدِ حیات تم — کانوں سے اپنے سنتے نویدِ سعیدِ فتح

بادشاہ

جھولا جھلا رہی ہے نسیمِ سحر تجھے — گہوارہ تیرا تختِ سلیماں سے کم نہیں
آتی ہر ایک چیز ہے خوش خوش نظر تجھے — دنیا میں تیرے واسطے رنج و الم نہیں

قبضہ ہے تیرے ہاتھ میں مصرِ قلوب کا — تجھ کو عزیز رکھتے ہیں سب جسم و جان سے
تعبیریں اسکی کرتے ہیں سن کر جدا جدا — جو لفظ بھی نکلتا ہے تیری زبان سے

اذکارِ دہر سے تجھے کچھ واسطہ نہیں — پیشِ نگاہ تیرے سماں اور کوئی ہے
تیرا کوئی فلک ہے نہ تیری کوئی زمیں — جسکا ہے تو مکیں وہ مکاں اور کوئی ہے

کس خوش نصیب باپ کا نورِ نظر ہے تو — جس کے لئے تو غیرتِ خورشید و ماہ ہے
کس مادرِ شفیق کا لختِ جگر ہے تو — جس کے لئے جہان کا تو بادشاہ ہے

بانسری کی دُھن

پیالہ پریم کا مُجھ کو پلا دے　　جو شکوے ہیں مِرے دِل میں مٹا دے
اُڑا دے چار تانیں پھر اُڑا دے　　ذرا پھر رنگ مستی کا جما دے
ذرا پھر بانسری کی دُھن سُنا دے

اُسی آواز کی مشتاق ہُوں میں　　کہ سوز و ساز کی مشتاق ہُوں میں
نیاز و ناز کی مشتاق ہُوں میں　　بنا دے مُجھ کو دیوانی بنا دے
ذرا پھر بانسری کی دُھن سُنا دے

نہ ہو کس طرح چہرہ زرد میرا　　کہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے درد میرا
ہُوا ہے یاس سے جی سرد میرا　　ذرا پھر آگ سی دِل میں لگا دے
ذرا پھر بانسری کی دُھن سُنا دے

مَیں روتی ہوں فسردہ حسرتوں کو　　شکستہ سالخوردہ حسرتوں کو
جلا دے میری مُردہ حسرتوں کو　　یہ اعجازِ مسیحائی دِکھا دے
ذرا پھر بانسری کی دُھن سُنا دے

میرے پہلو میں ارماں سو رہے ہیں　　میرے سرمایہ جاں سو رہے ہیں
کبھی کے خانہ ویراں سو رہے ہیں　　ذرا اِن سونے والوں کو جگا دے
ذرا پھر بانسری کی دُھن سُنا دے

یہ جمنا اور ٹھنڈا ٹھنڈا پانی　　یہ ہلکی ہلکی لہروں کی روانی
یہ عہدِ حُسن یہ جوشِ جوانی　　سُنا دے ہاں سُنا دے ہاں سُنا دے
ذرا پھر بانسری کی دُھن سُنا دے

کالا دیو

دِل پر مرے ہجومِ غم و رنج و یاس تھا
سارا جہان میری نظر میں اُداس تھا

رہ رہ کے بے بسی جو ڈراتی تھی مجھ کو آہ
وحشت برس رہی نظر آتی تھی مجھ کو آہ

تکلیف چارہ سازی کا یارا رہا نہ تھا
اُمّید و آرزو کا سہارا رہا نہ تھا

ہردم مہیب شکل جو دِکھلا رہا تھا کام
مجھ کو مثالِ کوہ نظر آ رہا تھا کام

بیٹھا ہُوا تھا کمرے میں با خاطرِ حزیں
تسکین کا نام تک نہ مرے دل میں تھا کہیں

اِتنے میں ایک دیو سا مجھ کو نظر پڑا
وُہ دیکھتے ہی مجھ کو بہت تُند ہو گیا

شکلیں طرح طرح کی دکھانے لگا مجھے
شکلیں دِکھا دِکھا کے ڈرانے لگا مجھے

دہشت سے ہو گیا یہ مرا حال اے وفاؔ
کاٹو تو نام کو بھی بدن میں لہُو نہ تھا

خوف و ہراس سے مرا سینہ دہل گیا
ایسا گماں تھا گویا کہ دم ہی نکل گیا

فوراً ہی لیکن اپنا کلیجہ سنبھال کے
بولا مَیں دیو کی طرف آنکھیں نکال کے

او نابکار مجھ کو ذرا تیرا ڈر نہیں
مَیں اہلِ دِل ہُوں کیا تجھے اِتنی خبر نہیں

دیو سیاہ چیز ہے کیا میرے سامنے
ہاں تجھ سا مرد چیز ہے کیا میرے سامنے

ڈٹ کر کھڑا رہوں گا مگر دَم نہ مارُونگا
منزل ہزار سخت ہو ہمّت نہ ہاروں گا

اِتنا سُنا جو مجھ سے ہَوا ہو گیا وُہ دیو
آگے مجھے خبر نہیں کیا ہو گیا وُہ دیو

نُکتہ ہے یہ بھی ایک بتا دُوں تجھے وفاؔ
دراصل عکس تھا وُہ مرے ہی خیال کا

ڈیک کی یاد ۲۸

ڈیک سیالکوٹ کے ضلع میں ایک نالہ ہے۔ مسٹر وفا ضلع سیالکوٹ کے ہی رہنے والے ہیں۔ اسلئے یہ نظم اسی نالے پر ہے۔ دیکھیں کسطرح ایک ایک مصرع میں حُبِ وطن کا جذبہ کُوٹ کُوٹ کر بھر دیا ہے۔

مرحبا اے ڈیک اے جانِ تقدس ۔ مرحبا
مرحبا اے مظہرِ شانِ تقدس ۔ مرحبا

اے مقدس دیوی تیرا گھر ہے کوہستان میں
تو پہاڑوں سے اُتر کر آئی ہے میدان میں

ہاں عقیدت آفریں ہے جوشِ طغیانی ترا
مجھ کو افضل تر ہے گنگا جل سے بھی پانی ترا

تیرتھ اپنا ایک قصبہ ہے وہاں ماڑی کلاں
تو ہمارے دیس میں پرویش کرتی ہے جہاں

دِل کو تیری یاد سے ہر وقت بہلاتا ہوں میں
بے خُودی میں آکے اکثر یہ غزل گاتا ہوں میں

آہ! وُہ ہمجولیوں کے ساتھ جانا ڈیک پر
یاد آتا ہے مجھے ساون منانا ڈیک پر

اب کہاں قسمت میں میری! اب کہاں مجھکو نصیب
جا کے ہر اتوار کو ڈیرہ لگانا ڈیک پر

ختم کر کے چھٹیاں اسکول کو جاتے ہوئے
بیٹھ رہنا ۔ بیٹھ کر گیتیں اُڑانا ڈیک پر

سچے معنوں میں ہماری ایکسکرشن تھی وُہی
گھر سے لیجانا پراٹھے اور کھانا ڈیک پر

وُہ عقیدت مند لوگوں کا نہانے کے لئے
یاترا کے طور پر چل چل کے آنا ڈیک پر

اور کسی فرقت زدہ مایُوس کا با قلبِ زار
اِک طرف ۔ لوگوں سے دُور ۔ آنسو بہانا ڈیک پر

پھُول تو گنگا میں ہی جائینگے لیکن اے وفا
بعدِ مُردن لاشں کو میری جلانا ڈیک پر

آتی ہے پربت سے تو اٹھکیلیاں کرتی ہُوئی
ہر جگہ دامانِ اہلِ آرزو بھرتی ہُوئی

تیرے گرد و پیش فیضِ عام جاری ہے ترا — قایم اب تک شیوۂ شاداب کاری ہے ترا
پاس سے جن جن زمینوں کے گزر جاتی ہے تو
اِک اُچھالے سے اُنہیں سیراب کر جاتی ہے تو

وُہ جو کہتے ہیں کہ تُو بے مُرشد و بے پیر ہے — کیا خبر اُن کو تری کیا عزّت و توقیر ہے
بے خبر شاکی عبث تیری غضبناکی کے ہیں — آہ! آخر رہنے والے عالمِ خاکی کے ہیں
کچھ حقیقت پر نظر اہلِ زمیں رکھتے نہیں — نام ہے جس کا نگاہِ دُوربیں رکھتے نہیں
تو تلاطم آشنائے انقلابِ روزگار — اِن کی ہستی سر بسر موجِ سرابِ روزگار
رکھنا اپنا ہی خیال اِن کا یہی دستور ہے — آپ ڈوبے تو جہاں ڈوبا مثل مشہور ہے
شانِ خلّاقی کو خالق کھو نہیں سکتا کبھی — بندے کا چاہا ہمیشہ ہو نہیں سکتا کبھی
آدمی کو دخل قُدرت کے اصُولوں میں نہیں — کونسا گلشن ہے کانٹے جسکے پھُولوں میں نہیں
آئیں جائیں اور مریں انساں۔ بہے جاتی ہے تُو
قایم اپنی وضعداری پر رہے جاتی ہے تُو

جانفزا ہے کس قدر تیرے کناروں کی بہار — کب پہنچ سکتی ہے اسکو لالہ زاروں کی بہار
پڑتی ہے موجوں پہ تیری جو کرن خورشید کی — ناچنے لگتی ہے بن بن کر جھلک اُمید کی
آہ! تیری ریت سے بھی میرے دلکو پیار ہے — تیرا ہر ذرّہ مجھے خالِ رُخِ دلدار ہے
ہے مرے سینے میں دِل اور دِل میں تیری آرزُو
پھر کروں تیری زیارت ہے یہ میری آرزو

جی میں آتا ہے جاؤں چل کے اُس ٹیک پر — اے وفا پھیلاؤں اُمیدوں کا دامن ٹیک پر
سُنتا ہوں آتے ہیں اکثر سیر کرنے کے لئے — ہوں مجھے بھی دوستوں یا رونکے درشن ٹیک پر

سونے والوں کو جگا کر عازمِ منزل کرے مثلِ آوازِ جرس ہو میرا شیون ڈیک پر
سمجھیں یہ بانگِ سحر اور وہ صدا ناقوس کی دوڑے آئیں سُنکے سب شیخ و برہمن ڈیک پر
مل کے جل پروا کردیں باہمی پرخاش کو اور بنائیں مذہبی رنجش کا مدفن ڈیک پر

کہہ چکا ہُوں اے وفا پہلے بھی پھر تاکید ہے
لاش کو میری جلانا بعدِ مُردن ڈیک پر

آہ! راوی کے نظارے بھا نہیں سکتے مجھے آہ! اے ڈیک اب تو یہ بہلا نہیں سکتے مجھے
سبزہ زاروں کی فضا مجھ کو بھلا سکتی نہیں بھُول کر بھی دِل سے تیری یاد جا سکتی نہیں
بے وطن ہُوں قیدِ غُربت سے چھُڑا لے تُو مجھے آہ! پھر اپنے کناروں پر بُلا لے تُو مجھے
آہ! مَیں مجبُور و بیکس۔ آہ! مَیں حسرت نصیب کاش یارانِ وطن کی ہو مجھے صحبت نصیب

اچھے ہیں یارانِ غُربت سے تو اغیارِ وطن
سنبل و ریحان سے بہتر ہیں مجھے خارِ وطن

برکاتِ امن

اے شہ امن مُبارک ہے بہت ذات تری عام ہیں سارے زمانے پہ عنایات تری
ذرّے ذرّے پہ نظر آتی ہیں برکات تری محو سب شُکر گزاری میں ہیں دِن رات تری

اِس طرح حق نمک تیرا ادا کرتے ہیں
کہ تیری عُمر درازی کی دُعا کرتے ہیں

دم قدم سے ترے قائم ہے نظامِ عالم دستِ تدبیر میں تیرے ہے زمامِ عالم

تیری خوشبو سے معطّر ہے مشامِ عالم بادۂ عیش سے معمور ہے جامِ عالم
زیر احکام ترے نظم و نسق دہر میں ہے
فیض جاری ترا دشت و جبل و شہر میں ہے
تیرے گلزاروں میں چلتی ہے ہوائے تہذیب گونجتی ہے ترے قصروں میں نوائے تہذیب
تُو ہے وہ نیّرِ تنویر فزائے تہذیب تیری کرنوں سے نکلتی ہے ضیائے تہذیب
بسکہ وابستہ ہے تہذیب قدم سے تیرے
زندہ شائستگی اعجازِ کرم سے تیرے
مُلکِ انصاف میں تیری ہی عملداری ہے کشورِ عدل میں فرمان ترا جاری ہے
تو جو آفاق میں سرگرم ضیا باری ہے سات پردوں میں نہاں جُرم و سیہ کاری ہے
بے اثر بیکسوں مظلوموں کی فریاد نہیں
خوفِ تعزیر سے اہلِ ستم آزاد نہیں
تُونے اربابِ فضیلت کو سرافراز کیا صاحبِ جاہ کیا۔ موردِ اعزاز کیا
اہلِ ہمّت پہ درِ لُطف و کرم باز کیا یعنی زائل اثرِ طالعِ ناساز کیا
زور کچھ چل نہ سکا اس میں دراندازوں کا
ناطقہ بند ہُوا مُفسدہ پردازوں کا

مولوی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی

تعارف

آپ ریاست رامپور کے رہنے والے اور منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم کے رشید شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ شاعری کے میدان میں چالیس پنتالیس سال سے توسنِ طبع کی جولانیاں دکھا رہے ہیں۔ آپ کی پرانی طرز کی غزلوں اور دیگر اصنافِ سخن کا ایک مبسوط دیوان تیار ہو چکا ہے لیکن اُردو زبان کی بدقسمتی کہ آپ نے اُسکی اشاعت کی طرف توجہ نہیں کی۔ آپ کا طرزِ جدید کا کلام ہندوستان بھر میں نہایت قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عالمِ خیال جس میں آپ نے ایک تصویر کے چار رُخ دکھائے ہیں۔ آپ کی اختراع نایقہ (ماسٹر پیس) ہے۔ اس میں خاص خوبی یہ ہے۔ کہ شروع سے لیکر آخیر تک اس میں اضافت کا استعمال نہیں کیا گیا۔ آپ کا خیال ہے کہ اُردو زبان میں جو ہندی اور اسلامی زبانوں کا مُرکب ہے۔ خالص ہندی خیالات کے ادا کرنے سے اُسکی وہ خوبیاں تمام و کمال قائم رہ سکتی ہیں جن کا ہندوستان کے جذبات کے لحاظ سے قائم رکھنا مذاقِ سلیم کے نزدیک ناگزیر ہے چنانچہ عالمِ خیال اور اِسی قبیل کی دیگر نظمیں اس امر کا بدیہی ثبوت ہیں۔ درحقیقت ہندوستان میں رہتے ہوئے کسی شاعر کے لئے لیلیٰ اور مجنوں، شیریں اور فرہاد، وامق اور عذرا جیسوں اور سیجوں کی تلمیحیں تراشنا اور مقامی ہستیوں اور مناظر کی نظر انداز کر جانا اِس امر کا روشن ثبوت ہے۔ کہ اُس کا کلام خلافِ فطرت و جذباتِ انسانی ہے۔

عالمِ خیال

ایک عورت کا شوہر پردیس میں ہے۔ وہ اُسکی یاد میں محو اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہے

آج او مرے خیال تو کہاں کہاں گیا
دل بھی تیرے ساتھ تھا، تو جہاں جہاں گیا

تُو نے رُخ جدھر کیا، دل کا رُخ اُدھر پھرا
تو پھرا جو پاس سے، دل بھر آیا، سر پھرا

جب سے وہ جُدا ہوئے تب سے اُنکا دھیان ہے
اُن سے مجھ کو اُنس ہے، اُن میں میری جان ہے

جا کے پھر مری خبر، کیوں نہ لی ستم کیا
میری یاد میری چاہ، کیوں نہ کی ستم کیا

مجھ سے کیوں خفا ہیں وہ پھر گئی نظر تو کیوں
دل نہیں اِدھر تو کیوں، رُخ نہیں اِدھر تو کیوں

میرے رُخ سے دور ہے، وہ نگاہ اب کہاں
اُن کا پیار اب کہاں، اُنکی چاہ اب کہاں

میں وہی ہوں یا نہیں، وہ وہی ہیں یا نہیں
اُنکے دل کی حالتیں وہ رہی ہیں یا نہیں

ساون اور یہ گھٹا، میں کہیں ہوں وہ کہیں
حُسن یہ اُنہیں کا ہے، اور وہ دیکھتے نہیں

ساتھ والیوں کے ساتھ، جھولنے کو جاؤں کیا
دل وہاں ہے وہ جہاں، بیدلی سے گاؤں کیا

پینگ آئیں جائیں گے، اور ہلے گا دل مرا
مل کے کیا میں گاؤں گی، کیا ملے گا دل مرا

کھل پڑے گی خود بخود، چاہ ہر صدا کے ساتھ
منہ سے باہر آئے گی آہ ہر صدا کے ساتھ

کرتی ہیں جگر کا خون ہمسنیں جو ساتھ ہیں
وہ لگا رہی ہیں آگ، جن کے لال ہاتھ ہیں

اور بھی لگائی آگ، ساونی نے پھول کر
پیڑ پر مری نظر، پھر پڑے نہ بھول کر

یہ شباب کی اُمنگ، اب کسے دکھاؤں میں
رُخ کا لال لال رنگ، اب کسے دکھاؤں میں

لال یہ کہاں رہا، زرد ہو کے رہ گیا
رنگ اب کہاں ہے رنگ، گرد ہو کے رہ گیا

جسم وُہ نہیں رہا، اِس میں کَس نہیں ہے اب
ہونٹھ وُہ نہیں رہے، اِن میں رَس نہیں ہے اب
جونک بنکے رات دِن چُوستا ہے غم لہو،
زرد ہو گیا بدن، رہ گیا ہے کم لہو،
کاجل اَور مِسّی کا لُطف، جب نہیں وُہی تو کیا
آئینہ میں خُود ہی میں دیکھتی رہی تو کیا
آرسی کو پھینک دُوں، مُنہ لگا کے کیا کرُوں
بن سنور کے کیا کروں، پان کھا کے کیا کرُوں
زیور اَب پہن چُکی، جی سے اب اُتر چکا
جائے بھاڑ میں سنگار، دِل اب اِس سے بھر چُکا
کِس سے ناز اَب کرُوں، میرے ناز اُٹھائے کون
رُوٹھنے کو رُوٹھ لُوں، لیکن اب منائے کون
کِس سے اپنے دِل کا بھید، اب میں کُھلکے کہہ سکوں
کِسکے ساتھ بے جھجک، اب میں مِلکے رہ سکوں
مانگتی جو کوئی چیز، اُن سے مُسکرا کے میں
ہنستے اُسکو دیکے وہ، ہنستی اُسکو پا کے میں
دِل میں اب لگی ہے آگ، دِلّگی وہ لے گئے
اب ہنسی کا مُنہ کہاں، سب ہنسی وہ لے گئے
یا تو مجھ سے چھین لے، اُنکی یاد اَے خُدا
یا تو اُن کو لا کے کر مجھ کو شاد اَے خُدا
یا تو کر سڑن مجھے، ہوش میں نہ آؤں میں
یا تو اپنے ہوش میں، اُن کو دیکھ پاؤں میں
کام کچھ نہ کر سکا، ادخیال جا کے تُو
مجھ سے کچھ نہ کہہ سکا، اُن کا حال آ کے تُو
تُو نے میرے دِل کا درد اُن سے کچھ کہا بھی تھا
اُن سے مِلکے تجھ کو یاد، میرا غم رہا بھی تھا
کیا میں تجھ سے پُوچھ اُٹھی، تو پیامبر نہیں
تجھ میں گو رسائی ہے، گفتگو مگر نہیں
گفتگو نہ ہو تو خیر، دِل پہ تیرا بس تو ہے
دِل کی دِل کو دے خبر، ہاں یہ دسترس تو ہے
پھر کے اُن کے دل کے گرد، گھیرنا ضرور تھا
اُن کے دِل کو میری سمت، پھیرنا ضرور تھا
اُن کے دِل میں کر کے راہ، کیوں نہ اُسمیں کی جگہ
تُو تو تھا مِرا خیال، کیوں نہ لی مری جگہ،
اُنکے دِل میں میری جا، شاید اب نہیں رہی
چھن گئی مری جگہ، اَور میں یہیں رہی
شاید اَور کوئی شکل، کُھب گئی نگاہ میں
کوئی روک ہو گئی، اِس طرف کی راہ میں

توبہ! ہوکے بدگمان میں نے کی خطا ضرور — چاہیے وہ کہیں رہیں، اُن میں ہے وفا ضرور

کاش او خیال تو اب نہ آئے میرے پاس — کاش اُنکی یاد تو، اب نہ لائے میرے پاس

یا مری نظر کو لے، اور اُن کے پاس جا — مجھ سے تو جگر کو لے اور اُن کے پاس جا

دیکھ لے نظر اُنہیں، دیکھ لیں جگر کو وہ — آئے مجھ پہ کچھ ترس، آئیں اپنے گھر کو وہ

گھر کا نام خاک لُوں، بن کے یہ بگڑ چُکا — اِس پہ اوس پڑ چکی، مِٹ چُکا، اُجڑ چُکا

چھت ٹپکتی ہے، تو اُنہہ، کون اُسکی لے خبر — رو رہی ہوں میں اِدھر، رو رہی ہے وہ اُدھر

رنگ خاک میں ملا، خاک رنگ پر چڑھی — رنگ اُسی قدر گھٹا، خاک جسقدر بڑھی

میں ہی خاک میں ملی، گھر کی فکر خاک ہو — اُن کا ذکر چھوڑ کر، گھر کا ذکر خاک ہو

وہ پلنگ اُنہیں کا ہے، اسباب ہے تو کون — خود ہی آکے وہ رہیں، جاکے یہہ کہے تو کون؟

اَٹ گیا ہے خاک میں، گرد ہو گیا پلنگ — آئیں وہ تو مجھ سے لیں، اور اِک نیا پلنگ

ذکر کیا پلنگ کا، یہ ذرا سی چیز ہے — مجھ کو اپنی جان تک، اُن سے کب عزیز ہے

راہ اُن کی روک لُوں، اب جو اُنکے پاؤں میں — پُتلیوں میں دُوں جگہ، سامنے بٹھاؤں میں

بال اپنے کھول کر، اُن پہ جال ڈال دُوں — جب ذرا قدم ہلیں، اُن پہ بال ڈال دُوں

ایں! یہ بولتا ہے کون، درد جسکے دل میں ہے — گرم آتی ہے ہوا، آگ اِسکے دل میں ہے

کوئی آکے پیڑ پر، کہہ رہا ہے "پی کہاں" — پی کہیں ہیں، میں کہیں، کیا کہوں ہے جی کہاں

جی رہی ہوں میں، مگر، جی مرا ہے پی کے ساتھ — پاس ہوں کہ دُور ہوں، ہیں وہ میرے جی کے ساتھ

آئی اُن کی سمت سے، اور بُوبھی لائی تو — آج او ہوا ضرور، اُن کو چھو کے آئی تو

اُن سے مِلکے آئی ہے، آ تری بلائیں لُوں — تُو نے خوش کیا مجھے، لے، تجھے دُعائیں دُوں

جاکے اُن کے پاس پھر، تو جو اُن کو لا سکے — درد دِل کا جا سکے، چین دِل کو آسکے

او دِل اَور کیا کرُوں، تیرے درد کا علاج — خط میں لکھ کے بھیجیے دِل تجھ کو اُنکے پاس آج
شرط ہے کہ میرے پاس پھر پلٹ کے آئے تُو — اپنے خُون کی قسم دے کے اُن کو لائے تُو
یُوں نہ آئیں تو بس یُوں شوق کی کشش سے کام
کھنچکے آئیں اِس طرح، تو نہ لیں اُدھر کا نام

لُطفِ سحر

وُہ دن کے لئے سرُور کا وقت — وُہ لُطفِ سحر وُہ نُور کا وقت
آہستہ نسیم کا وُہ چلنا — سُورج کا وُہ آڑ سے نِکلنا
شفّاف وُہ آبجو چمن کی — بھینی بھینی وُہ بُو چمن کی
مُنہ پھُولوں کے دھو گئی ہے شبنم — سبزے کو بھگو گئی ہے شبنم
نوکوں پہ جو قطرے تھم گئے ہیں — دانے موتی کے جم گئے ہیں
کلیوں سے لکیر سی ہویدا — کچھ قصدِ تبسّم اُن سے پیدا
دِل کو جو لُبھایا رنگ و بُو نے
او حُسن کشش یہ دی ہے تُو نے

بادل کا پھٹنا

وُہ ہَوا نے زور باندھا اَور بادل پھٹ گیا — کُھل گیا خورشید کا چہرہ کہ پردہ ہٹ گیا

بچھ گیا ہے دھوپ سے سونے کا پتّر ہر طرف
خوب برساتی ہیں کرنیں ہن زمیں پر ہر طرف

صحن سونے کا ہے چھت سونے کی گھر سونے کے ہیں
پھول پھل پتّے ہیں سونے کے شجر سونے کے ہیں

کیمیا گر ہے مگر عالم میں خورشیدِ فلک
جس کی صنعت سے پہاڑوں میں ہے سونے کی چمک

مختلف چڑیاں اُڑیں کوّے اُڑے چیلیں اُڑیں
اپنے اپنے آشیانے سے ابابیلیں اُڑیں

بھوک سے ہیں سب پرندے اور چرندے بے حواس
ڈھونڈھتا ہے کوئی کیڑے کوئی پھل اور کوئی گھاس

ہے نرالی سب سے خرگوشوں کے چلنے کی ادا
کیا بھلی معلوم ہوتی ہے اُچھلنے کی ادا

سبز میدانوں میں پھرتے ہیں ہرن چرتے ہوئے
دیکھ لیتے ہیں مگر چاروں طرف ڈرتے ہوئے

برسات کی شام

۸۲

دن ہے کم دیکھو ہٹا مغرب سے وہ ابرِ سیاہ
کھل گئی دنیا میں آنے کے لئے کرنوں کی راہ

بن گیا خورشید ہلکے رنگ کے سونے کا طشت
دھوپ سے کچھ کچھ سنہرے ہو گئے اشجار و دشت

وہ شفق کی سرخ رنگت اور فلک کا مرغزار
ساونی پھولی ہوئی گویا دکھاتی ہے بہار

کوہ کے دامن میں یا لالے کا تختہ ہے عیاں
یا جسے کہتے ہیں چرخ اِک کوہ ہے آتش فشاں

جلوہ گر ہے چرخ پر سورج کے پرتو سے دھنک
یا اُٹھا پردہ کھلی محرابِ ایوانِ فلک

یا کسی کے واسطے کھولے ہے آغوشِ آسماں
یا لئے ہے دوش پر ترکِ فلک اپنی کماں

دستکاری اپنی کی معمارِ قدرت نے عیاں
سات رنگوں سے رنگا ہے طاقِ قصرِ آسماں

آمدِ بہار

ہُوا چاروں طرف اقصائے عالم میں پُکار آئی | بہار آئی بہار آئی بہار آئی بہار آئی

بہار آئی دکھائی قادرِ مطلق کی شان اس نے | زمیں کی تہ میں جو مُردے تھے ڈالی اُن میں جان اس نے

بہار آئی ہے نیچر اپنی نقاشی دکھاتا ہے | بہت رنگین نقشے سامنے آنکھوں کے لاتا ہے

جہاں سے مِٹ گیا برگِ خزاں کا بدنما سکّہ | بہار اب ڈھالتی ہے اشرفی کے پھول کا سکّہ

ہوائے صبح اِس کے ساتھ پنکھا جھلتی آتی ہے | ہنسی پڑتی ہیں کلیاں جب یہ اُنکو مُنہ لگاتی ہے

پہاڑوں سے بہایا اِس نے برفِ صاف پگھلا کر | رواں ہو کر وہی پانی سمندر میں ملا جا کر

شمیمِ باغ نے سیکھا چلن اترا کے چلنے کا | زمانہ آگیا پردہ سے سبزے کے نکلنے کا

دُلھن کی شکل ہر گُل نے لباسِ سُرخ پہنا ہے | شجر کے جسم پر کیا خوشنما پھولوں کا گہنا ہے

ہوا مشاطگی پر نیّرِ اعظم جو آمادہ | سنوارا مختلف رنگوں سے دُنیا کا رُخِ سادہ

تعجب کیا جو ہیبت سے خزاں کے رُخ پہ زردی ہے | کہ وہ فوجِ اسپہ غالب آئی جس کی سُرخ وردی ہے

نکل آئے حجابِ ارض سے گُل پیرہن لاکھوں | کہیں ہیں سرو قد لاکھوں کہیں غنچہ دہن لاکھوں

پلاتی ہے شجر کو اوس اپنا دُودھ لا لا کر | محبت سے ہَوا مُنہ چومتی ہے بار بار آ کر

جڑیں اندر ہی اندر پھیل کر قوت پکڑتی ہیں | زمیں ان کو جکڑتی ہے زمیں کو وہ جکڑتی ہیں

چمن اور دشت میں ہے ہر طرف انبار پھولوں کا | جدھر دیکھو زمیں پہنے ہوئے ہے ہار پھولوں کا

عیاں سبزہ پہ اُلفت کی ادائیں کی ہیں سورج نے | بڑھا کر ہاتھ کرنوں کی بلائیں لی ہیں سورج نے

ہیں روشن چاندنی کے پھول یا تارے چمکتے ہیں | کھلے ہیں پھول لالے کے کہ انگارے دہکتے ہیں

ہزاروں رنگ کی چڑیاں ہیں شکلیں خوشنما جن کی | ادائیں دلربا جن کی صدائیں نغمہ زا جن کی

بہار آنے سے خوش ہیں کہ طرف اِترانی پھرتی ہیں　　ہَوا تو ناچتی پھرتی ہے چڑیاں گاتی پھرتی ہیں
دیا ہے تتلیوں کو رزق کا سامان پھُولوں نے　　کیا بھونروں کو جوشِ فیض سے مہمان پھولوں نے
ہَوا ہی نے کھلائے گُل ہَوا ہی پھر گراتی ہے　　زمیں جس نے کیا پیدا وُہی پھر انکو کھاتی ہے

غرض اے شوقؔ اترانا عبث ہے حُسنِ فانی پر
گھمنڈ انسان کو نا زیبا ہے دو دن کی جوانی پر

تتلیاں

پر کھول کے تتلیوں کی پرواز　　پر جوڑ کے بیٹھنے کا انداز
اِس پھُول سے اُڑ کے اُس پہ بیٹھیں　　رس لے کے اُڑیں وُہ جس پہ بیٹھیں
نازک نازک وُہ خوشنما پر　　اُڑتی ہُوئی پتّیاں ہَوا پر
وُہ نقش و نگار اور وُہ بُوٹے　　پر اُن کے چھوڑو تو رنگ چھوٹے
رنگ اِن میں بہت مِلے ہُوئے ہیں　　پر کیا ہیں چمن کھلے ہُوئے ہیں
ہیں رنگ کئی ہر ایک پَر پر　　چھوٹا سا چمن ہے ان کا ہر پر
ہر خال ہے پر پہ اِک نگینہ　　سونے چاندی پہ یا ہے مینا
قدرت دیکھو کہ کل چمن ہیں　　گلدستے ہیں تتلیوں کے تن میں
جو نقش و نگار سے ہے خالی　　وُہ بھی ہے دل کی لُبھانے والی
ہے رنگ کسی کا زرد گہرا　　اتنا گہرا کہ بس سُنہرا
کوئی جس کے سپید ہیں پر　　جیسے چاندی کے صاف پتّر

طاؤسی، صندلی، گلابی　　دھانی، کاہی، سیاہ آبی
نیلے، اودے، زمردی لال　　ہر رنگ کے پر ہیں بے خط و خال
پرواز بھی حسن ہے پھبن بھی
رنگت بھی ہے حسن سادہ پن بھی

جنگل کی رات

جنگل کی اندھیری رات سنسان　　بادل بھی گھرا ہوا پریشان
جھونکوں میں غضب کی سنسناہٹ　　شاخوں میں رگڑ بلا کی آہٹ
پیڑوں کا وہ ہولناک انداز　　شیروں کی وہ خوفناک آواز
شعلوں کا وہ خود بخود بھڑکنا　　پتوں کا وہ جابجا کھڑکنا
وہ بوم کا ہو، وہ ہو کا عالم　　وہ وہم کی صورتِ مجسم
او حسن وہاں بھی جلوہ گر تو
جگنو بن کر اِدھر اُدھر تو

منشی رشید احمدؐ صاحب آرشد۔ تھانوی

تعارف

آپ کا نام منشی رشید احمدؐ صاحب آرشد اور وطن قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر صوبجات متحدہ ہے۔ آرشد صاحب جو کچھ لکھتے ہیں وُہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ لیکن یہ اختصار تاثیر کے لحاظ سے طوالت کو شرماتا ہے۔ الفاظ کی بندش اِتنی پختہ اور ایسی شگفتہ ہوتی ہے۔ کہ پا اُفتادہ خیالات الفاظ کا جامہ پہنکر عالمِ بالا پر پہنچ جاتے ہیں۔

میرا مکان۔ تشبیہ غالب اور آہ! وہ دن ایسی نظمیں ہیں۔ کہ اگر اُن کا انگریزی میں ترجمہ کر کے کسی دُوسرے مُلک میں مسٹر سروجنی نیڈو کے نام سے شایع کر دیا جائے۔ تو وہاں نقادانِ سخن کو دونوں کے کلام میں امتیاز کرنا دشوار ہو جائے۔

حضرت آرشد کے خیالات وجدانی جذبات اور رُوحانی کیفیات سے مملو ہوتے ہیں۔ اور پھر وُہ اُنہیں اِس نفاست کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ کہ پڑھنے والوں پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مُلک کے مشہور اور نامور رسالے آپ کی نظموں کو امتیازی حیثیت سے شایع کرتے ہیں +

سرد مہری

دیکھا جو آسمان کو مَیں نے نظر اُٹھا کر
دل کو لُبھا رہا تھا ہر تارہ جگمگا کر

اَے کاش یُونہی میرا بھی کوکبِ مُقدر
نُور افگنی دکھاتا۔ زرّین شعاعیں پا کر

اِک آہ پُرشرر کی سوزِ دروں سے میں نے
رکھا اُسے ستاروں نے کہکشاں بنا کر

گلزار میں شگفتہ اِک پھُول میں نے دیکھا
جو ہو بہو نمونہ تھا میرے زخمِ دِل کا

اپنے جگر کے مَیں نے دکھلائے داغ اُسکو
پھُولا پھلا تھا میرا بھی گُلشن تمنا

وہ خوشنما گُل تر۔ رنگینیِ مُعطّر
پژمردہ ہو گیا اور مُرجھا گیا سراپا

چڑیا کا ایک جوڑا جو چہچہا رہا تھا
میٹھے سُروں میں اُلفت کا راگ گا رہا تھا

مَیں نے اُسے سنایا اپنا غمِ نہانی
گو وہ ترانہ ہائے دلکش سُنا رہا تھا

نغمہ سرائی اُسکی افسردگی سے بدلی
خاموش ہو کے اب وُہ آنسو بہا رہا تھا

لیکن۔ وہ جسکی میرے دِلمیں بھری۔ ہے اُلفت
وہ جسکی میری رگ رگ میں ساری ہے مُحبت

وُہ جسکے واسطے میں صدمے اُٹھا رہا ہُوں
برداشت کر رہا ہُوں آلام بے نہائت

اظہار دردِ دل کا اُس سے کیا جو مَیں نے
پایا جواب "اپنی تقدیر اپنی قسمت"

آہ! وہ دن

۴۴

جب تک کہ میں وارفتۂ جاناں نہؤا تھا — منت کشِ اندوہِ فراواں نہؤا تھا

ایامِ محبت سے سروکار نہ تھا کچھ! — وقفِ الم کاہشِ پنہاں نہؤا تھا

تھا بے خبر تلخیِ انجامِ تمنا! — پیدا کوئی جذبہ کوئی ارماں نہوا تھا

ناکامیِ پیہم کے اٹھائے تھے نہ صدمے — خمیازہ کشِ گردشِ دوراں نہؤا تھا

برہم زنِ جذبات نہ تھی یاس کی تاثیر — احساسِ غمِ اندوزیِ حرماں نہؤا تھا

تھا دردِ نہاں سے نہ طلبگار مداوا — دل واقفِ مجبوریِ درماں نہؤا تھا

ہر طرح کے اسباب فراغت کے تھے میسّر — تنگ آنے کا جان سے کوئی ساماں نہؤا تھا

شوریدگیوں سے نہ تھا محتاج تسلی — تسکین کا شرمندۂ احساں نہؤا تھا

غمخواریِ احباب کی حاجت نہ تھی مطلق — ممنونِ ہوا خواہیِ یاراں نہؤا تھا

حاصل تھی جسے کہتے ہیں جمعیتِ خاطر — شیرازۂ طبیعت کا پریشاں نہؤا تھا

[illegible] خیالات میں آزادگیاں تھیں — اندیشۂ باطل سے ہراساں نہؤا تھا

محرومیِ قسمت کے نہ تھے شکوے زباں پر — برگشتگیِ بخت سے حیراں نہؤا تھا

اک گلشنِ شاداب تھی ہستی مری ارشدؔ
تاراجِ خزاں یہ چمنستاں نہؤا تھا

شبیہِ غالب

سامنے آنکھوں کے کس کا پیکرِ تصویر ہے — جس کی خاموشی میں بھی اِک لذّتِ تقریر ہے
دیکھنے والے پہ طاری ہے اِرادت کا وفور — چشمِ نظّارہ کو حاصل ہے زیارت کا سُرور
آہ! یہ ہے غالبؔ جنت نشین خُلد آشیاں — باعثِ اعزازِ دِلّی۔ نازشِ ہندوستان
جو نظیر اپنی تھا خُود اِس عالمِ ایجاد میں — اور اب خوابیدہ ہے خاکِ جہان آباد میں
زندگی بھر جو رہا سرمستِ صہبائے سخن — مرتے مرتے بھی نہ چھوڑا جامِ مینائے سخن

مرگیا لیکن ہجومِ شوق باقی رہ گیا
مِٹ گیا پھر بھی وفورِ ذوق باقی رہ گیا

آہ! اے جلوہ فروزِ رُوئے زیبائے سخن — تو وُہ مجنوں تھا، فِدا تھی جس پہ لیلائے سخن
تجھ سے اُردو کا ہُوا روشن چراغِ شاعری — آسماں پر تُونے پہنچایا دماغِ شاعری
شاعرانہ کیفیت دیکر عوام النّاس کو — تُو نے زندہ کردیا موسیقیِ احساس کو
تُو بہارستانِ وجدانی کو لایا جوش میں — اور کی تحریک پیدا فطرتِ خاموش میں
دِل میں جذباتِ لطیفہ کا تلاطم کردیا — رُوح کو ممنونِ اندازِ تبسّم کردیا
فلسفہ رنگِ تصوف کا عیاں تجھ سے ہُوا — عام فیضِ لُطف اور راکِ نہاں تجھ سے ہُوا

ہاں بقولِ خویش، کردے دہر را مستانۂ
"ہر حرف غالبؔ چیدہ اے میخانۂ"

کیفیتِ نظارہ

جس طرح نیّرِ اعظم سے ہے دُنیا روشن
تیری تنویر سے دِل ہے یُوں ہی میرا روشن

کُچھ سوا تیرے نہیں دیتا دکھائی مجھ کو
ہے تری جلوہ گہِ ناز خُدائی مجھ کو

ہر ستارے میں ضیا دیکھ رہا ہُوں تیری
ہر گُلِ تر میں ادا دیکھ رہا ہُوں تیری

قطرہ قطرہ میں مجھے تُو ہی نظر آتا ہے
آئنہ خانہ سمندر ترا بن جاتا ہے

ذرہ ذرہ میں تری جلوہ گری پاتا ہُوں
محوِ دلچسپیِ دیدار میں ہو جاتا ہُوں

پتّے پتّے سے ترا عکس لُبھاتا ہے مجھے
بُوٹا بُوٹا ترے انداز دِکھاتا ہے مجھے

تجھکو ہر منظرِ پیدا میں نہاں دیکھتا ہُوں
تجھ کو ہر ہستیِ پنہاں میں عیاں دیکھتا ہُوں

میری آنکھوں کے لئے حُسنِ تبسّم تُو ہے
میرے کانوں کے لئے لُطفِ ترنّم تُو ہے

واسطے دِل کے مرے مرکزِ جذبات ہے تُو
سببِ لذّتِ نیرنگِ خیالات ہے تُو

مُجھکو جس نیند میں تُو چاہے سُلا دیتا ہے
جس فضا میں ترا جی چاہے جھُلا دیتا ہے

دوڑتا پھرتا ہُوں میں وادیِ ایمن میں کبھی
تیرنے لگتا ہُوں سرچشمۂ روشن میں کبھی

کبھی پرواز شعاعوں میں کیا کرتا ہُوں
کبھی تابانیوں کا ساتھ دیا کرتا ہُوں

جا پہونچتا ہُوں کبھی برق کی رخشانی میں
کبھی آجاتا ہُوں پھر پیکرِ انسانی میں

کر دیا تُو نے مئے دید سے مخمور مجھے
دے دیا عالمِ نظّارگی نُور مجھے

وقفِ مصروفیتِ جذبِ تماشا ہُوں میں
سچ تو یہ ہے، ہمہ تن دیدۂ بینا ہُوں میں

میرا گھر

(جو قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ہے)

میرا گھر واقع ہے جنگل میں بھی آبادی میں بھی
قید قصبہ میں بھی ہے صحرا کی آزادی میں بھی

بے ہمہ و باہمہ ہونے کی پوری شان ہے
یعنی بستی کے کنارے پر سرِ میدان ہے

اس کے پیچھے کی طرف دو مختصر تالاب ہیں
کچھوے، مینڈک، مچھلیوں کی زیست کے اسباب ہیں

مغربی جانب کنوئیں کے پاس قبرستان ہے
میری پیاری ماں جہاں سوتی باطمینان ہے

سمتِ مشرق زندگانی کے ہیں برپا کاروبار
جتنا آگے بڑھیئے آتا ہے نظر ہنگامہ زار

قصرِ عالیشان آتے ہیں نظر سوئے شمال
عہدِ ماضی کا عیاں کرتے ہیں جاہ و جلال

اک محل پر مجھ کو بھی ہے اقتدارِ ملکیت
گو حقیقت میں نہیں کچھ اعتبارِ ملکیت

اس سے تو بڑھ کر کہیں چھوٹا سا یہ گھر ہی مجھے
ہر طرح کی جس میں آسائش میسر ہے مجھے

ہیں ضرورت کے موافق اسمیں سقف و بام بھی
بیٹھ جائے ایک بارش میں نہیں ہے خام بھی

اک شرارہ پھونکدے وہ پھوس کا چھپر نہیں
جل کے رہ جائے ذرا میں ایسا میرا گھر نہیں

تنگ ہو کر باعثِ فکر و تحیر بھی نہیں
کاخِ شاہی کی طرح وجہِ تکبر بھی نہیں

سادگی سے بندۂ احسانِ زیبائش نہیں
بنگلے کوٹھی کی طرح محتاجِ آرائش نہیں

الغرض ہے درجۂ اوسط کا اچھا یہ مکان
شکر ارشد اُس خدا کا جسنے بخشا یہ مکان

ہے جو کنجِ غم مرا اور پُر فضا گلزار بھی
اک تماشہ ہے کہ اس میں نور بھی ہے نار بھی

میں اگر خوش ہوں تو رونق اس پہ بھی آجاتی ہے
میں ہوں رنجیدہ اداسی اس پہ بھی چھا جاتی ہے

زندگی

۴۵

وُہ سیلِ زندگانی۔ پُرجوش وُہ سمندر جاری ہیں جسکی موجیں۔ میری رگوں کے اندر
وُہ لہریں لے رہا ہے ہر ایک بحر و بر میں برپا ہے اِسکا طُوفاں دُنیا کے خشک و تر میں

خاکِ زمیں کے اندر خوابیدہ زندگی ہے سبزہ کی شکل ہو کر روئیدہ زندگی ہے
ملفوف پتّیوں میں ہے صُورتِ مُسرّت پھُولوں میں آ گئی ہے بن کر وجودِ نکہت

ہے زندگی فضا میں ہے زندگی بقا میں ہلکوریں لے رہی ہے گہوارۂ فضا میں
ہے مدو[illegible] ہستی شایانِ زندگانی مِلتا نہیں ہے ہرگز پایانِ زندگانی

مجھ کو بھی کیف بادہ مخمور کر چُکا ہے احساسِ زندگانی مغرور کر چُکا ہے
رقصاں ہے [illegible] بِ زبانِ زندگی سے ہوں لُطف کوش میں بھی حالاتِ زندگی سے

مہاراج بہادر برقؔ - دہلوی - منشی فاضل

تعارف

منشی مہاراج بہادر نام ہے۔ برقؔ تخلّص کرتے ہیں۔ آپ کی ذات کائستھ ہے۔ عمر تیس سال کے قریب، آپ رہنے والے دہلی کے ہیں بہت دیر سے نظم کہتے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ خوب کہتے ہیں۔ ممدوح میرزا داغؔ کے شاگرد ہیں۔ اسلئے نظم میں اُن کی شاعری کا بیشتر رنگ غالب ہے۔ آپ کی زبان نہائیت پاکیزہ ہے۔ غزل بھی کہتے ہیں۔ اور اُس میں ایک شان پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنی شاعری پر آپ کو خود فخر ہے۔ اور اُس کے خلاف اعتراض سُنکر ضبط نہیں کر سکتے۔ پچھلے دنوں آپ نے بی ا

اِمتحان پاس کیا ہے۔ آج کل دہلی [illegible] ں

دفتر میں ملازم ہیں۔ اور یہ ملازمت [illegible] ہے

بچے کی گلابی مسکراہٹ

خندۂ گل میں یہ رنگینی کہاں　　یہ لطافت یہ شیرینی کہاں
اِس صباحت پر یہ نمکینی کہاں　　اِس میں ہے جائے سخن چینی کہاں

ختم ہے اس لعل لب پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

غنچۂ نو کا تبسم زیرِ لب　　دلفریبی کی ادا میں ہے غضب
اُس میں پر اتنا کہاں جوشِ طرب　　شان ہے تیرے تبسم کی عجب

ختم ہے اِس لعلِ لب پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

دِل کُشا ہے خندۂ جامِ بلور　　اِس میں ہے اک خاص کیفیت ضرور
گی کا پر نہیں اِتنا وفور　　جس سے نور آنکھونکو ہو دِلکو سرور

ختم ہے اِس لعل لب پر واہ وا
خوسم　یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

دِلربا ہے کی دمک　　فرحت افزا ہے ستاروں کی چمک
ے　　پر کہاں اُن میں یہ نورانی جھلک

یہ لعل لب پر واہ وا
نیم وا کلیوں میں بانکی آن ہٹ کی ادا

آفریں کی شان ہے

حُسن زن کا تازگی کی جان ہے   تجھ سے رُوکش ہوں یہ کب امکان ہے

ختم ہے اِس لعل لب پر واہ وا
یہ گلابی مُسکراہٹ کی ادا

مُسکراہٹ شمع کی ہے دِل گُداز   اُسکے شعلے میں ہے رنگِ سوز و سازؔ
ہے اثر سے تازگی کے بے نیاز   اِس میں کب ہے یہ ادائے جاں نوازؔ

ختم ہے اِس لعل لب پر واہ وا
یہ گلابی مُسکراہٹ کی ادا

خندہ زن ہوتے ہیں جب غنچہ دہاں   دِل جلوں پر ٹُوٹتی ہیں بجلیاں
اُن کا ہنسنا سو تکلّف کا نشاں   جلوۂ معصُومیّت اُسمیں کہاں

ختم ہے اِس لعل لب پر واہ وا
یہ گلابی مُسکراہٹ کی ادا

کوئی حسرت کش ہے یا مہجُور ہے   شادمانی جس سے کوسوں دُور ہے
لاکھ جوشِ غم سے دِل معمُور ہے   تُجھ سے مِلتے ہی نظر مسرُور ہے

ختم ہے اِس لعل لب پر واہ وا
یہ گلابی مُسکراہٹ کی ادا

ہلکی ہلکی تیرے ہونٹوں پر ہنسی   مایۂ فرحت ہے جانِ زندگی
موجِ رقصاں ہے صفائے قلب کی   اِسمیں قُدرت نے بھری ہے دِلکشی

ختم ہے اِس لعل لب پر واہ وا
یہ گلابی مُسکراہٹ کی ادا

جانفزائی اس کی اِک تاثیر ہے　　غم زدوں کے حق میں یہ اکسیر ہے
مرہم زخم دِل دِل گیر ہے　　جس سے دِل روشن ہوں وُہ تنویر ہے

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

جلوۂ انجم میں نُور اِتنا کہاں؟　　حُسن وخوبی کا ظہور اِتنا کہاں؟
جامِ صہبا میں سُرور اِتنا کہاں؟　　شادمانی کا وفور اِتنا کہاں؟

ختم ہے اِس لعل لب پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

آئینہ ہے قلبِ نُورانی ترا　　پر تو افگن جسمیں ہیں صدق و صفا
جلوۂ حُسن آفریں ہے رُونما　　ہے تبسّم اُس کا عکسِ پُر ضیا

ختم ہے اس لعل لب پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اَے گُلِ تر

مُشتاقِ حُسنِ دلکش شیدائے رنگ و بُو ہوں　　وارفتۂ تماشا بیتاب جُستجو ہوں
پر تیری ماہیت سے بیگانہ ہُوں سراسر　　کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اَے گُلِ تر

تیرے جمال کا ہے دِلدادہ مہرِ انور　　کرتا ہے یہ سُنہری کرنیں نثار تجھ پر

بے چین کر رہا ہے تیرا رُخِ منوّر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر

یہ آسماں کی مشعل وُہ ماہتابِ تاباں
ہیں تیرے گرد پھر کر۔ دیوانہ وار حیراں
اِس شوق کا صلہ ہے۔ ایک خندہ رُوح پرور
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر

اوجِ فلک پہ تارے ہیں محوِ دید سارے
در پردہ دیکھتے ہیں یہ حُسن کے نظارے
شبنم کے کر رہے ہیں تجھ پر گہر نچھاور
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر

میری نظر میں تُو ہے۔ جامِ شرابِ شبنم
رنگیں ادائیوں کا اِک نُور ہے مجسّم
تصویر ناز کی ہے یا خندۂ مصوّر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر

خُود رفتہ کر رہا ہے رہ رہ کے شوقِ پنہاں
تجھ پر مٹی ہوئی، ہے کیا عندلیبِ نالاں
مہرِ سکوت لیکن ہے پھر بھی تیرے لب پر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر

دامن لبھا رہی ہے اپنا نسیم تجھ سے
ہے مَوج مَوج اُس کی عنبر شمیم تجھ سے
فیضِ کرم سے تیرے گلزار ہے معطّر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر

پانی میں عکس تیرا کیا لُطف دے رہا ہے
موجوں کا آبگینہ۔ تصویر لے رہا ہے
چشمِ نظارہ بن کر ہے ہر حباب مضطر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر

تیری شگفتگی ہے اِک رازِ حسنِ قُدرت پنہاں ہے تازگی میں اعجازِ حسنِ قُدرت
رگ رگ میں بس رہے ہیں تیرے لطیف جوہر کھلتا نہیں معمہ تو کیا ہے اے گلِ تر

شانِ حق

شیرازہ بندِ دفترِ امکان ہے شانِ حق سرچشمۂ حیات ہے فیضِ روانِ حق
سیرابِ ابرِ لُطف ہیں لبِ تشنگانِ حق ذرّے زبانِ حال سے ہیں تر زبانِ حق

حق کی صدا ہے پردۂ ہستی کے ساز میں
درپردہ بس رہی ہے حقیقت مجاز میں

زینت فزائے عالمِ اسباب ہے وُہی شانِ فروغِ ماہِ نظرتاب ہے وُہی
رنگینیِ رُخِ گلِ شاداب ہے وُہی ضوبخشِ برقِ غیرتِ سیماب ہے وُہی

[illegible] کی ضیا سے نُور کا مطلع جہان ہے
ذرّوں میں آفتابِ درخشاں کی شان ہے

رُوئے مجاز عکس ہے حق کی صفات کا پرتو اس آئینے میں ہے انوار ذات کا
حق اصلِ کل ہے سلسلۂ کائنات کا اعجازِ حق ہے رازِ طلسمِ حیات کا

ظُلمت سرائے دہر میں ہے حق کی روشنی
جلوہ فشاں ہے قادرِ مُطلق کی روشنی

زیبِ ریاضِ دہر اگر فیضِ حق نہ ہو رنگیں کتابِ خندۂ گُل کا ورق نہ ہو
نیرنگ ہفت رنگ بہارِ شفق نہ ہو عالم فروز تابشِ مہرِ اُفق نہ ہو

اس تیرہ خاکدانمیں برستا جو نور ہے
حق تو یہ ہے۔ یہ جلوۂ حق کا ظہور ہے
دُنیا میں ذاتِ حق سے یہ سب بندوبست ہے　　انجام حق ہی ہستیٔ فانی میں ہست ہے
کذب و ریا کو حق کے مقابل شکست ہے　　تابش سے حق کی تیرگیٔ کفر پست ہے
رکھتا ہے اصل پیشِ حقیقت دروغ کیا
باطل کو حق کے سامنے ہوگا فروغ کیا

رات بھر جلوہ فروزِ محفلِ عشرت رہی　　بزم میں تیری تجلی وجہ صد زینت رہی
تیری پروانوں سے شب بھر گرمیٔ صحبت رہی　　دونوں جانب سے بھڑکتی آتشِ اُلفت رہی
کوئی پروانہ جو گر کر ہوگیا فی النار بھی
تا سحر ٹوٹا نہ تیرے آنسوؤں کا تار بھی
رات بھر تُو نے مزے لُوٹے ہیں سوز و ساز کے　　دیدنی تھے رنگ تیری جلوہ گاہِ ناز کے
تجھ سے سیکھے ڈھنگ پروانوں نے ضبطِ راز کے　　حوصلے نکلے بقدرِ ظرف ہر جاں باز کے
بوسہ لینے جو بڑھا رخسارِ آتشناک کا
تھا نشان دودِ سیہ اُسکے غبارِ خاک کا
تیرے دم سے گرمیٔ ہنگامۂ محفل ہوئی　　تُو ضیا بخشِ نظر۔ فرحت فزائے دل ہوئی
پردۂ فانوس میں تو لیلیٔ محمل ہوئی　　رُخ سے جب پردہ ہٹا رشکِ مہِ کامل ہوئی

جوت جاگی جب ترے حسنِ نظر افروز کی
جان میں جان آگئی پروانۂ جانسوز کی

لَو لگائے تجھ سے ساری رات پروانے رہے لب پہ جانبازوں کے سوزِ غم کے افسانے رہے
سب شرابِ آتشیں پی پی کے مستانے رہے جوش میں آپے سے باہر تیرے دیوانے رہے

شعلہ روئی پر تری مٹتے رہے سو جان سے
گرد پھر پھر کر ہوئے صدقے ہزار ارمان سے

جان پر کھیلا کئے تفتیدگانِ سوزِ عشق آگ میں گرتے رہے آتش بجانِ سوزِ عشق
دم نہ مارا جل بجھے گو سرگرانِ سوزِ عشق ساتھ اپنے لے گئے رازِ نہانِ سوزِ عشق

جوشِ بیتابانہ آخر کار فرما ہو گیا
درمیاں سے پردۂ بیگانگی وا ہو گیا

عشق نے پیدا کیا رنگِ اثر دونوں طرف سوزشِ اُلفت نے بھڑکائے شرر دونوں طرف
لاگ کی جب آگ پھیلی تیز تر دونوں طرف کر لیا سوزِ وفا نے دل میں گھر دونوں طرف

سوختہ ساماں جو کوئی خاک جل کر ہو گیا
موم تیرا بھی دلِ مضطر پگھل کر ہو گیا

دونوں جانب سے ہوئے نازو نیازِ حسن و عشق منکشف ہونے لگے سربستہ رازِ حسن و عشق
رنگ لائی لذتِ سوز و گدازِ حسن و عشق ہو گئے یکجاں دو قالب جاں نوازِ حسن و عشق

کچھ نہ پروانے کو سوجھا فرطِ غم کے جوش میں
لے لیا تجھ کو تڑپ کر حلقۂ آغوش میں

تا کمر پہنچے جو بڑھ کر گیسوئے لیلائے شب حسن میں تیرے بڑھی شانِ دل افروزی غضب

تجھ سراپا شعلۂ آتش سے ہو کر لب بلب　　ہو گیا ٹھنڈا دلِ پروانۂ حسرت طلب
چند ساعت وصل میں جب یُوں بسر ہونے لگی
آنکھ جھپکاتے شبِ عشرت سحر ہونے لگی

رات بھیگی۔ اوس نے چھینٹے دِئے گلزار پر　　آگیا کچھ کچھ عرق تیرے گُلِ رُخسار پر
پھر گئی زردی سی رُدئے مطلعِ انوار پر　　رات بھاری ہو گئی تیرے دلِ بیمار پر
لاکھ ہاتھوں چھاؤں رکھا اہلِ محفل نے تجھے
پھونک کر اُف کر دیا پُرسوزشِ دل نے تجھے

پڑ گیا پھیکا فروغِ حُسنِ لاثانی ترا　　ملگجا سا ہو گیا ملبُوسِ نُورانی ترا
چھا گیا محفل میں دُودِ سوزِ پنہانی ترا　　ڈھل گیا سائے کی صُورت نُورِ پیشانی ترا۔
دستِ حسرت تیری حالت پر ملے گلگیر نے
رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑا حُسن کی تنویر نے

پردۂ شب اُٹھ گیا کھُلنے لگے اسرارِ صُبح　　ہو گئی تو سرد پیشِ گرمیٔ بازارِ صُبح
عالمِ بالا پہ چمکا مطلعِ انوارِ صُبح　　تیرگی رُخصت ہوئی ظاہر ہوئے آثارِ صُبح
چرخ پر ڈُوبے ستارے چاندنی پھیکی ہُوئی
بڑھ چلا نُورِ سحر۔ کافور تاریکی ہُوئی

نُورِ خور جب زیبِ دامانِ اُفق ہونے لگا　　خاکدانِ دہر کا روشن طبق ہونے لگا
تیرے رُدئے آتشیں کا رنگ فق ہونے لگا　　عارضِ رنگیں ترا سادہ ورق ہونے لگا
ہستیٔ بے بُود آخر دے گئی دھوکا تجھے
کر گیا ٹھنڈا نسیمِ صُبح کا جھوکا تجھے

تیرے گُل ہوتے ہی قِصّہ مختصر کچھ بھی نہ تھا خواب کا نقشہ تھا سب رنگِ اثر کچھ بھی نہ تھا

کھُل گیا جُز بے ثباتی جلوہ گر کچھ بھی نہ تھا رات بھر کی ساری رونق تھی سحر کچھ بھی نہ تھا

شمعِ کُشتہ! تُو مجسّم یاس کی تصویر ہے
یا بیاضِ صبح پر اندوہ کی تفسیر ہے

منشی عبد الخالق صاحب خلیق دہلوی

تعارف

آپ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ اور کسی پرائیویٹ فرم میں ملازم ہیں۔ طرزِ قدیم و جدید پر آپ کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ آپ کے کلام کا کوئی حصہ لطف سے خالی نہیں ہوتا۔ پرگوئی اور روانی آپ کا طغرائے امتیاز ہے۔ ملک کے اکثر نامور اخبارات و رسائل میں آپکا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے تحیر کلام کا مجموعہ کلامِ خلیق حصہ اول کے نام سے شائع ہوکر مقبولِ انام ہوچکا ہے۔ آپ کی زبان محاورہ دہلی کی جان ہے۔ آپ غزل گو شعرا خصوصاً میرزا داغ دہلوی کے شاگردوں کی طرح متروکات کے پابند نہیں - - - - آپ کے نزدیک اس التزام سے زبان محدود ہو جاتی ہے۔

عبادت گزار

(ایک تصویر کو دیکھ کر)

کیا سبق آموز ہیں انداز اِس تصویر میں
کوئی عورت ہے سراپا ناز اِس تصویر میں

پریم کی مورت ہے بھگتی کر رہی رام کی
جپ رہی ہے دل میں مالا ایشور کے نام کی

بال کھولے زلف کے چندن کا ماتھے پر تلک
زیب دیتا ہے جبین پر بن گیا زیور تلک

ہیں کشیدہ ابروئیں محراب مندر کی طرح
موج زن ہے حسن کا دریا سمندر کی طرح

بادۂ عرفاں سے آنکھیں جام کی مانند ہیں
مردمِ دیدہ نہیں ہیں میکدے میں رند ہیں

آنکھ میں ہے نورِ وحدت دھیان ہیں ہر سے لگے
شبد گھٹ میں سن رہے ہیں کان ہیں ہر سے لگے

حسن کے خوشے ہیں یا کانوں میں جھمکے بالیاں
دو تو باہیں نخلِ قامت کی ہیں گویا ڈالیاں

ناک میں خوشبو ہے اُن پھولوں کی جو ہر پر چڑھیں
سانورے مرلی منوہر شام کے سر پر چڑھیں

خامشی سے رٹ رہے ہیں لب اُسی کے نام کو
یاد میں آٹھوں پہر رکھتی ہے اپنے رام کو

لگ رہی ہے نام کی لذت سے تالو میں زباں
لوٹتی ہے نظمِ قدرت دیکھ کر طبع رواں

شیشۂ بلور کی گردن صراحی دار ہے
زیبِ گردن بیش قیمت موتیوں کا ہار ہے

ہے گلو بندِ مرصع اور بازو بند ہے
چوڑیاں سونے کی کہتی ہیں یہ دولتمند ہے

پاؤں میں مہندی رچی ہے بانک ہے پہنے ہوئے
اتنے گہنوں کے سوا صدق و صفا گہنے ہوئے

سبز رنگوں کی طرح پوشاک ہے رشکِ چمن
بے نہا نیم آستین پھولوں کی ہے زیبِ بدن

ریشمی ساڑھی میں گلکاری ہے گلشن کی طرح
گنگا جمنی بیل ہے جمنا کے دامن کی طرح

سامنے رکھے ہوئے ہیں پھول تازہ فرش پر
آفریں محوِ عبادت ہیں نگاہیں عرش پر

ایستادہ بارگاہِ حق میں ہے بھگتی کے ساتھ صدقِ دل سے جوڑ رکھے ہیں جنائی دونو ہاتھ
اے خلیق زار کچھ سیکھو سبق تصویر سے یاد رکھو اپنے خالق کو اسی تدبیر سے
عیش و عشرت میں بھی مالک کو نہ بھولو ایک پل
تم کو عقبےٰ میں عبادت کا ملے گا نیک پھل

شہیدوں کی یادگار

وطن کے نام پہ دی جان جن شہیدوں نے ستم کشی کی رکھی آن جن شہیدوں نے
بلند قوم کی کی شان جن شہیدوں نے سر اپنے کر دئیے قربان جن شہیدوں نے
تڑپ کے مر گئے جو مرغِ نیمجاں کی طرح
لہو میں غرق ہوئے صیدِ بے زباں کی طرح

جو نام کر گئے سر دے کے جاں نثاری کا جہاں میں شور ہے جنکی وفا شعاری کا
نہ خوف تھا جنہیں توپوں کی شعلہ باری کا جنہیں گراں ہوا صدمہ نہ زخم کاری کا
لہو سے جن کے ہوئی سرخ خاک دلی میں
بندھی ہے جنکی شہادت سے دھاک دلی میں

غضب کا جن کے جنازوں پر اژدہام ہوا شمار جس کا نہ تھا وہ ہجوم عام ہوا
فدائیانِ وطن کا وہ احترام ہوا کہ نقش دل کے نگینوں پر اُن کا نام ہوا
ہر ایک آنکھ نے آنسو بہائے اُن کے لئے
کہ روئے پھوٹ کے اپنے پرائے اُن کے لئے

اِک ہال ان کے لئے شاندار بنتا ہے　　ستم کشوں کے لئے یادگار بنتا ہے
وفا کا نقش سرِ رہ گذار بنتا ہے　　یہ مرمٹوں کا نشانِ مزار بنتا ہے

ہر ایک شخص پہ تعمیر فرض ہے اِس کی
ہزار طرح سے تدبیر فرض ہے اِس کی

بڑھا کے ہاتھ دو اِس قومی کام کا چندہ　　گرہ سے نکلے شہیدوں کے نام کا چندہ
ہزار کا ہو کہ ہو ایک دام کا چندہ　　ہو پبلک ہال میں ہر خاص و عام کا چندہ

وہ ہاتھ اُٹھائے جو حُبِّ وطن کا شیدا ہے
ثواب عام ہے دے جس کو جو کہ پیدا ہے

جو آج نام سے چندہ کے مُنہ چھپاؤ گے　　تو پھر جہان کو کس مُنہ سے مُنہ دِکھاؤ گے
کبھی جو نام شہیدوں کا مُنہ پہ لاؤ گے　　یہ یاد رکھنا کہ غیروں سے مُنہ کی کھاؤ گے

کہیں گے لوگ شہیدوں کو اپنے بھول گئے
وہ اپنی جان سے اِن کے لئے فضول گئے

ہر اک طرف سے مناسب ہے بارشِ زر ہو　　نہ ٹوٹے تار۔ لگاتار ہو۔ برابر ہو
خصوصیت نہیں مُفلس ہو یا تونگر ہو　　یہ کارِ خیر ہے دے جس کو جو میسر ہو

ہو یادگارِ زمانہ وہ پبلک ہال بنے
خلیق قومی عمارت ہے بے مثال بنے
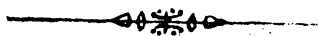
ایک ہی نام سے سب نام ہُوئے ہیں پیدا
نند کے لال جگل شیام ہُوئے ہیں پیدا

آپ ہی رام بنا آپ ہی گھنشام بنا
اور گوکل میں جسودھا کا دلارا م بنا

آپ چمکا تھا سرِ طور تجلّی ہوکر
چشمِ موسیٰ سے رہا دُور تجلّی ہوکر

اُس کے اعجاز سے اعجازِ مسیحائی تھا
وُہی یوسفؑ کے لئے صورتِ زیبائی تھا

تفرقہ ذاتِ حقیقی میں نہیں ہے بالکل
ایک ہی باغ میں آباد ہیں گل اور بلبل

نشۂ بادۂ وحدت سے جو مسرور ہُوئے
اَے خلیقؔ جگر افگار وہ منظور ہُوئے

آپ ہی آپ ہیں سب غیر کا کچھ کام نہیں
ذاتِ مطلق میں کہیں شکل نہیں نام نہیں

درحقیقت دِگرے نیست خُدائیم ہمسر
لیک از گردشِ یک نُقطہ جُدائیم ہمسر

Shoe as 10
Cigg 0/4
Cigg 0/6
Charity 0/2
Milk debt 1/8
Mai 0/4
Bibai 0/6 2

1-0-0
13-4
0-0-8

13/4
2
15/4

1/8

مُتفرّقات
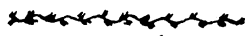
میر اپنے گھر کا حال

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال　　اِس خرابی میں میں ہُوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے　　سخت دل تنگ یُوسفِ جاں ہے
کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ　　کوٹھڑی کے حباب کے سے ڈھنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم　　تر تنک ہو تو سو کھتے ہیں ہم
لون لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی　　آہ کیا عُمر بے مزہ کاٹی
اِس چکش کا عِلاج کیا کیجئے　　راکھ سے کب تلک گڑھے بھریئے
جا نہیں بیٹھنے کو راہ کے بیچ　　ہے چکش سے تمام ایوان کیچ
آنکھیں بھر لاکے یہ کہے ہیں سب　　کیونکر پردہ رہیگا یا رب اب
جھاڑ باندھا ہے مینہ نے دِن رات　　گھر کی دیواریں ہینگی جیسے پات
باڑیں کانپتے ہوں جو تھر تھر　　اِن پہ پردا رکھے کوئی کیونکر
کیچ لے لے کے بارے چھوپا ہے　　چھوپنا کاہے کا ہے تھوپا ہے
ایک حُجرہ جو سب سے ہے اچھا　　سُنئے اب اسکا حال مجھ سے ذرا
کہیں سُوراخ ہے کہیں ہے چاک　　کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھُوسوں نے کھود ڈالا ہے　　کہیں چُوہے نے سر نکالا ہے

کہیں گھر ہے کسو چھچوندر کا ‏ شور ہر کونے میں ہے مچھر کا

کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے ‏ کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے

کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں ‏ پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں

آگے اس حجرہ کے ہے اک ایواں ‏ وہی اس تنگِ خلق کا ہے مکاں

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ ‏ اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ

کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے ‏ کبھو چھت سے ہزار پائی گرے

کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے ‏ کوئی داسا کہیں سے چھوٹا ہے

دب کے مرنا ہمیشہ مدِ نظر ‏ گھر کہاں صاف موت کا ہے گھر

مٹی تو وہ جو ڈالیں چھت برہم ‏ تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم

دی ہیں اڑواڑیں جو حد سے زیاد ‏ چل ستوں سے مکاں دے ہے یاد

اینٹ مٹی کا گھر کے آگے ڈھیر ‏ گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

کنگنی دیوار کی نپٹ بدحال ‏ پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال

طوطا مینا تو ایک بابت ہے ‏ پودنا پھدکے تو قیامت ہے

کیونکہ ساون کٹیگا اب کی بار ‏ تھرتھرا دے بھنبیری سی دیوار

ہو گیا ہے جو اتفاق ایسا ‏ شاق گذرے ہیں کیا کہوں جیسا

ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب ‏ اڑ بھنبیری کہ ساون آیا اب

تیزی یاں جو کوئی آتی ہے ‏ جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ ‏ کہیں کھسکے تو ہے قیامت تنگ

ایک دن ایک کوا آ بیٹھا ‏ بے گماں جیسے ہوّا آ بیٹھا

نہیں وُہ زاغ چار پاؤں پھرا — ایک کالا پہاڑ آن گرا

مٹی اِس کی کہیں کہیں کھسکی — جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی

سان کر خاک لگ گئے دو چار — بارے جلدی درست کی دیوار

اچھے ہونگے کھنڈر بھی اِس در سے — برسے ہے اِک خرابی گھر در سے

اُکھڑے بکھرے کواڑ ٹوٹی وصید — زُلفی زنجیر ایک کُہنہ جدید

خاک لو ہے کو جیسے کھاوے پاک — چھیڑ دیکھیئے تو پھر نری ہے خاک

بند رکھتا ہُوں در جو گھر میں ہوں — قدر کیا گھر کی جب کہ میں ہی نہوں

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور — ہے خرابی سے شہر میں مشہور

جس سے پُوچھو اسے بتائے شتاب — ساری بستی میں ہے یہی تو خراب

ایک چھپر ہے شہر دِلّی کا — جیسے رَوضہ ہو شیخ چلّی کا

بانس کی جا دیئے ہیں سرکنڈے — سووے مینھوں میں سب ہوئے ٹھنڈے

گُل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب — پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

مینہ میں کیوں نہ بہہ گئے یکسر — پھونس بھی تو نہیں ہے چھپر پر

واں جو ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا — یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا — کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں — پیچ کوئی لڑاؤں فند کروں

بس کہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی — کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں — کوئی سمجھے ہے یہ کہ خسیلا ہوں

بان جھینگر تمام چاٹ گئے — بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

تنکے جاندار ہیں جو بیش و کم
اُن پہ چڑیوں کی جنگ ہے باہم

ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور
ایک مگری پہ کر رہی ہے شور

بوریا چھپیل کر بچھا نہ کبھو
کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو

ڈیوڑھی کی یہ خُوبی در ایسا
چھپّر اس چوچلے کا گھر ایسا

جنس اعلےٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے پٹّی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو مَیں بچھاتا ہُوں
سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہُوں

کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے
کھانے کو شام ہی سے دوڑا ہے

ایک چُٹکی میں ایک جُھنگلی پر
ایک انگوٹھے پر ایک اُنگلی پر

گرچہ بُہتوں کو مَیں مسل مارا
پر مجُھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پُوریں
ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

ہاتھ تکیہ پہ گہہ بچھونے پر
کبھی چادر کے کونے کونے پر

سِلسلایا جو پائیتی کی اور
وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور

توشک ان رگڑوں میں ہے سب پھاٹی
ایڑیاں یُوں رگڑتے ہی کاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان
ساری کھاٹوں کی چولیں نکلیں ندان

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو
پائے پٹّی لگائے کوٹنے کو

سوتے تنہا نہ بان میں کھٹمل
آنکھ، مُنہ، ناک، کان میں کھٹمل

اِک ہتیلی میں ایک گھائی میں
سینکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیئے
کب تلک یُوں ٹٹولتے رہیئے

یہ جو بارش ہُوئی تو آخر کار　　اِس میں سی سالہ وُہ گری دیوار
دو طرف سے تھا کتوں کا رستہ　　کاش جنگل میں جا کے میں بستا
ہو گھڑی دو گھڑی تو دھتکاروں　　ایک دو کُتّے ہوں تو میں ماروں
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں　　چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کس سے کہتا پھروں یہ صحبتِ نغز　　کُتّوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس　　خوابِ راحت یہاں سے سو سو کوس
قصّہ کوتاہ دل اپنا کھوتا ہُوں　　رات کے وقت گھر میں ہوتا ہُوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

(میر تقی مرحوم)

طلوعِ آفتاب

صُبحدم دروازۂ خاور کھُلا　　مہرِ عالم تاب کا منظر کھُلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں　　شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا
وُہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود　　صُبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا
سطحِ گردُوں پر پڑا تھا رات کو　　موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا

صُبح آیا جانبِ مشرق نظر
اِک نگارِ آتشیں رُخ سر کھُلا

(غالب)

نُورِ ظہُور کا وقت

وُہ صُبح اَور وُہ چھانو ستاروں کی اَور وہ نُور دیکھے تو غش کرے ارنی گوے اوج طُور
پیدا گلوں سے قُدرتِ اللہ کا ظہُور وُہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیُور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہُوا پھُولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزۂ صحرا کی وُہ لہک شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وُہ جھُومنا درختوں کا پھُولوں کی وُہ مہک ہر برگِ گُل پہ قطرۂ شبنم کی وُہ چمک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتّے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وُہ نُور اَور وُہ دشت سُہانا سا وُہ فضا دُرّاج کبک تیتر و طاؤس کی صدا
وُہ جوشِ گل وُہ نالۂ مُرغانِ خُوش نوا سردی جگر کو بخشتی تھی وُہ صُبح کی ہَوا
پھُولوں کے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گُل فروش تھے

وُہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وُہ سبزہ زار پھُولوں پہ جا بجا وُہ گہرہائے آبدار
اُٹھنا وُہ جھُوم جھُوم کے شاخوں کا بار بار بالائے نخل ایک جو بُلبُل تو گُل ہزار
خواہاں تھے زہرِ گلشنِ زہرا جُو آب کے
شبنم نے بھر دئیے تھے کٹورے گُلاب کے

وُہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم کُوکُو کا شور نالۂ حق سِرّہٗ کی دُھوم

سُبحان ربّنا کی صدا تھی علی العموم جاری تھے وہ جوان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِّ عُلا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خُدا کی مدح

(انیسؔ)

نُورِ الٰہی

جب فوجِ اختری کو خورشید نے بھگایا سلطانِ شرق جس دم تختِ فلک پہ آیا
جب حکم مہر و مہ نے عزل و نصب کا پایا لیلائے شب نے ڈنکا جب کوچ کا بجایا
لایا ہر ایک ذرّہ ظاہر ظہور تیرا
خورشید بن کے چمکا جو تھا وہ نُور تیرا

جب رات کا اندھیرا عالم پہ آکے چھایا خورشید نے اُفق میں جب بستر لگایا
جب فرش چاند تارے کا چرخ نے بچھایا قندیل ماہ لیکر زنگیِ شب جو آیا
انجم دِکھا رہے تھے ظاہر ظہور تیرا
ہر نجم کی ضیا میں روشن تھا نُور تیرا

جب باغ میں گیا میں گلگشت کے بہانے نکلے شجر کے پتّے تیرا پتا بتانے
سوتے تھے جتنے سبزے چادر فلک کی تانے جاگ اُٹھے اِک سرے سے سب نام حق جگانے
گاتے تھے گلستاں میں نغمہ طیور تیرا
جس گل کا چہرہ دیکھا اُس پر تھا نُور تیرا

یوں شوق مجھ کو لایا لہرا کے سُوئے دریا پیاسے کو جس طرح سے ہو جستجوئے دریا

تھا غرق بحرِ حیرت میں دو بدوئے دریا — جن گوہروں سے افزوں تھی آبروئے دریا
اُن میں بھی غائبانہ دیکھا ظہور تیرا
دُرِ خوشاب میں بھی ظاہر تھا نُور تیرا

بالائے کوہ جب میں مانندِ کاہ آیا — سنگ و شرار دونوں کو ایکساتھ پایا
باندھے کمر کھڑا تھا کوہِ گراں خُدایا — تحمید کا مُصلّا صحرا کو تھا بنایا
جلوہ دِکھا رہا تھا جو کوہِ طُور تیرا
اُس پر بھی بہرِ مُوسیٰ چمکا تھا نُور تیرا

جب چھوڑ کر کلیسا سوئے کنشت آیا — حُسنِ ازل کا عالم روئے صنم میں پایا
گویا خُدا نے اپنے ہاتھوں اُسے بنایا — اُس کی جھلک سے جُھک کر مَیں یہ زبان پہ لایا
حسنین گنج تیرا۔ ہے رام نُور تیرا
دَیر و حَرم میں یکساں پھیلا ہے نُور تیرا

جب دشتِ پُر خطر میں مانندِ قیس بھٹکا — آنکھوں میں ہر بگولا کانٹے کی طرح کھٹکا
خود رو گلوں نے بھی واں دامن نہ مجھ سے جھٹکا — نِکلی صدائے اشہد غنچہ جو کوئی چٹکا
چُھپتا تھا ہر درندہ نامِ ظہور تیرا
نُورِ شہاب میں تھا رخشندہ نُور تیرا

صحرا میں بھی خضر نے پایا نشان تیرا — کشتی پہ وجد کرتا تھا بادبان تیرا
اور رنگ حسن قدرت تھا آسمان تیرا — جلوے دِکھا رہا تھا سارا جہان تیرا
پھیلا جلال پایا نزدیک و دُور تیرا
اندھا تھا خود وہ جسکو سُوجھا نہ نُور تیرا

تو رنگ بن کے ظاہر یا بو بنا چھپا تھا   تیری چمک نہیں تھی تو پھر گلوں میں کیا تھا
دیرِ جہاں میں دیکھا جس مہ جبیں کا ماتھا   اسکی جھلک میں بیشک پرتو ترا پڑا تھا

اِس جسمِ زار میں بھی کچھ تھا وہ نُور تیرا
کہتے تھے نُور جسکو ہم تھا وہ نُور تیرا

جب شمع انجمن میں ہمدم جلا کے لائے   پروانے لَو لگائے جانسوز بنکے آئے
پروانہ جان کی تھی دم بھر نہ جینے پائے   کیا شئے تھی شمع جسکو رکھتی تھی سر چڑھائے

روشن تھا اِس میں جلوہ ربِّ غفور تیرا
تھا شمع کی جلا میں رخشندہ نُور تیرا

جب کان میں گئے ہم اِک لُطف آ رہا تھا   دیکھا کہ اختروں کو ہیرا چِھکا رہا تھا
نیلم سے چرخ نیلی چکرایا جا رہا تھا   ہر لعل لالہ رویوں کو خُون رُلا رہا تھا

تھا اِن جواہروں میں حُسنِ و فُور تیرا
جسمِ بلور میں بھی لامع تھا نُور تیرا

ہے خاکدان خالی۔ہے آسمان خالی   گر تو نہیں تو ہیں سب کون و مکان خالی
تجھ سے نہیں خدایا کوئی جہان خالی   کافی ہے رہرواں کو تیرا نِشان خالی

قائل تھا زندگی بھر جس طرح مُور تیرا
طالبؔ بھی دیکھتا ہے ہر شئے میں نُور تیرا

(ونائک پرشاد۔طالبؔ)
بنارسی

زمانہ

یہ دُنیا جھمیلا ہے اور کچھ نہیں ہے بقا ایک ریلا ہے اور کچھ نہیں ہے
یہ کڑوا کریلا ہے اور کچھ نہیں ہے گھڑی بھر کا میلا ہے اور کچھ نہیں ہے

بقا اِسکی کونپل فنا اِس کی جڑ ہے
فقط اِک مِٹا دینے والی رگڑ ہے

بگڑنے میں تقدیر ہے یہ زمانہ پلٹنے میں تاثیر ہے یہ زمانہ
نہ بننے میں تدبیر ہے یہ زمانہ خیالی سی تصویر ہے یہ زمانہ

یہ جاتا ہے ہاتھوں سے آرام ہو کر
یہ مِلتا ہے اچھا بُرا نام ہو کر

محبت کے پردے میں سفاک بالکل مروت کے گھونگٹ میں بیباک بالکل
متانت کی اوٹوں میں چالاک بالکل مِٹا دینے والا مگر خاک بالکل

کبھی بے پئے مست ہو جانے والا
کبھی حوصلہ پست ہو جانے والا

وہ شکلیں کہ لٹتا تھا گنجینہ جن سے وہ شکلیں کہ مِٹتا تھا ہر کینہ جن سے
وہ شکلیں تعلق تھا دیرینہ جن سے وہ شکلیں چمکتا تھا آئینہ جن سے

بگاڑیں اِسی نے مٹائیں اِسی نے
حجابِ فنا میں چھپائیں اِسی نے

یہ اپنے میں شانِ ستم پانے میں طاقت یہ بڑھنے میں افسوس گھٹنے میں ہمت

یہ اُڑنے میں ہے، وقت پڑنے میں آفت　　اُلجھنے میں دِل ہے بگڑنے میں نیّت
یہ حالت ہے اِکدم پلٹ جانے والی
یہ اُمید ہے بڑھ کے گھٹ جانے والی

یہ چہرے ہیں سب چاند گہہ جانے والے　　یہ نقشے ہیں سب یاد رہ جانے والے
یہ دریا کے قطرے ہیں بہہ جانے والے　　یہ ہیں سارے آثار ڈِہ جانے والے
یہ جانیں ہیں سب صید ہو جانے والی
یہ شکلیں ہیں ناپید ہو جانے والی

یہ ہے سبز پتہ مگر زرد بالکل　　یہ ہے گرم بستر مگر سرد بالکل
یہ ہے غازۂ رُخ مگر گرد بالکل　　یہ ہے دارُوئے دِل مگر درد بالکل
یہ درماں ہے لیکن اثر کچھ نہیں ہے
زمانہ ہے سب کچھ مگر کچھ نہیں ہے

مُضطر

کالیداس کی برسات

جھومتے ہیں مست ہاتھی کی طرح ابر سیاہ　　برق کی تابندگی جن میں ہے، ہم شکلِ نشان
بج رہے ہیں رعد کے نقارہ بام چرخ پر　　یا کہ پیش ابر ہے کوئی نقیب خوش بیان
جو کہ ہے عشرت پرستوں کا انیس و غمگسار　　آگیا وہ موسم برسات اے جانِ جہان
صورت برگ کمل یا شکل سرمہ نیلگون　　بدلیاں چھائی ہوئی ہیں آسمان پر جابجا
جو پپیہے اور چڑیاں پیاس سے تھیں بیقرار　　شربت دیدار سے کرتی ہیں اُن کو شادکام

رعد کی آواز سے برسانے والا ابر تر — ہے خراماں ناز سے شکلِ بتِ نازک خرام
بھاری بھاری بوندیاں تھیں صورت باران تیر — ہے کمان قوسِ قزح کی جنکے شیون میں نئی
برق پرچم ہے صدائے رعد ہے قرنائے جنگ — کر رہی ہیں بدلیاں پردے یونکی دل دہی
کونپلوں سے ہیں بہاران چمن آراستہ — سبزۂ نوخیز سے ہے مخملی فرشِ زمین
دامن صحرا عروساں سے ہوا اس طرح سرخ — جس طرح ہو طوق پر ہاں سے گلوئے مہ جبین
مست ہو کر ناچتے ہیں طالبِ بوس و کنار — بلکہ پھیلائے ہوئے ہم شکلِ زلفِ نازنین
رعد کی آواز سننے کے لئے ہیں بے قرار — قابلِ نظارہ ہے ورد ونکی حالت بالیقین
بہ رہی ہیں ندیاں شوقِ وصالِ بحر میں — جنکی تیزی نے اکھاڑے ہیں کناروں کے درخت
گو کہ میلے آب سے پر ہیں مگر ہیں یوں رواں — جا رہی ہو جسطرح مستی میں کوئی شوخ مست
نیلی نیلی کونپلیں نکلیں گیاہِ سبز میں — شاخہائے نخلِ برگِ نو سے ہیں آراستہ
دل مسخر کر رہا ہے منظرِ دلچسپ یہ — ہو رہا ہے دشت ہم شکلِ گلِ نوخواستہ
دلربائی کر رہا ہے سبزۂ فرشِ زمین — چوکڑی بھرتے ہیں جسپر جوشِ مستی میں ہرن
صورتِ چشم کمل ہیں جنکی آنکھیں دیدہ زیب — دیکھ کر یہ منظرِ دلکش مچل جاتا ہے من
آسمان پر چار سو گھنگھور چھائی ہے گھٹا — رعد کی آواز سن سن کر دھنستی ہے زمین
برق [illegible] کر چمکتی ہے اندھیری رات میں — جا رہے ہیں خلوتِ جاوید میں جس سی حسین
ڈر رہے ہیں مہ جبین سن سنکے بادل کی کڑک — چھپ رہے ہیں شوہر بدخو کے بھی آغوش میں
جنکے شوہر جا رہے پردیس ہیں ان شوخ کی — چشم ہم چشمِ کمل سے بہتی ہے اشکوں کی دھار
جنکے چہروں عارضِ گلگوں کی سرخی ڈھل گئی — زیورِ تن دور ہے ہیں بڑھ گئے سارے سنگھار
بہ رہا ہے پر خس و خاشاک سے آبِ سفید — ٹیڑھی ترچھی چال ہے ہم صورتِ رفتاریاں

جا رہا ہے خوف سے چھپنے کو وہ سوئے نشیب
لیکن اُسکو تک رہی ہے ایک مینڈک کی قطار

نغمۂ دلکش سناتے والے بھونرے ھوکے میں
چھوڑ کرکے لہلہاتے غنچہائے نیلوفر

ناچتے ہیں مور پھیلائے ہوئے پر جو کہیں
بیٹھتے ہیں نو دمیدہ گل کمل کا جان کر

کالے کالے مست بھونرے گونجتے ہیں شکل عد
پھول کا رس چوسنے کو پھر رہے ہیں ہر طرف

کوہ کا دلچسپ منظر کر رہا ہے دل کشی
ناچتی پھرتی ہے جس پر مست موروں کی قطار

ہوگئی ہیں چوٹیاں ڈھل ڈھل کے جنکی پاک وصاف
دے رہا ہے اُنکو بوسہ اضطراب جوئے بار

ابر باراں سے ہوا کے جھونکے ٹھنڈے پڑ گئے
ہل رہے ہیں جن سے ارجن نیم سرجا کیتکی

نکہت گل کو لئے پھرتے ہیں جو آغوش میں
کس کے دل میں وہ نہیں کرتے ہیں پیدا گدگدی

وہ حسین تا کمر لٹکی ہیں جن کی کاکلیں
جنکے سینوں پر پڑے ہیں خوشنما پھولوں کے ہار

عارض گلگوں سے جنکے تھی خماری عیاں
نوجوانوں کے دلوں کو کر رہی ہیں بیقرار

جو گھٹا قوس قزح کی وجہ سے ہے دیدہ زیب
جسمیں رہ رہ کر چمک اُٹھتی ہے بجلی بار بار

وہ حسین غیرت الماس جن کا رنگ ہے
کر رہی ہیں دونوں یہ پردیسیوں کو بیقرار

گوندھتے ہیں کیتکی کیسر کدم کے گل کے ہار
موسم برسات میں معشوقہ زہرہ جبین

اپنے سینے کرتے ہیں اِن ہاروں سے آراستہ
بالیاں ارجن کی ہیں آویزۂ گوش حسین

بوئے صندل سے معطر ہیں حسینوں کے بدن
پھول کی کلیوں سے گوندھی ہیں بتوں نے چوٹیاں

دیکھ کر کالی گھٹائیں سنکے بادل کی کڑک
شام سے ہی لے رہے ہیں وہ خلوت گل رخاں

نیلی نیلی بدلیاں ہم صورت رنگ کمل
کر رہی ہیں گشت دھیرے دھیرے کے ہمراہ ہوا

بوجھ سے پانی کے گویا اٹھ نہیں سکتے قدم
صورت مہتاب ہیں قوس و قزح سے خوشنما

وہ پریشان کر رہی ہیں اُن گل نوخیز کو
جو کہ ہیں خاوند کی فرقت سے غم میں مبتلا

سوزِ قلب دشت میں بارش سے ٹھنڈک پڑ گئی ۔۔۔ چار جانب ہے گُلِ شاخِ کدم سے باغ باغ
کیتکی کی کلیوں کو ہر سو ہنساتی ہے نسیم ۔۔۔ کھا رہا ہے رقصِ شاخِ گُل سے گردوں دلپہ داغ
موسمِ بارش کہلاتا ہے اشوک و کیتکی ۔۔۔ گوندھنے کو ہار پھولوں کے حسینوں کیلئے
نو دمید و گل سے ہیں آراستہ جو ہیں کدم ۔۔۔ کان کے زیور کو ہیں کچنار میں گچھے لگے
موتیوں کے ہار سے سینے سجاتے ہیں صنم ۔۔۔ ریشمی باریک کپڑے کرتے ہیں زیبِ بدن
آبِ تازہ میں نہانے سے کھڑے ہیں رونگٹے ۔۔۔ حسن افزوں کر رہی پیٹ میں پڑ کر شکن
گو کہ بارش کے سبب خورشید میں ٹھنڈک پڑی ۔۔۔ پر جلانے کو دلِ غربت زدہ ملتیار ہے
بارِ گُل سے جھک گئیں شاخیں مگر تر مُردہ ہیں ۔۔۔ کیتکی کی خاک میں خوشبوئے عنبر بار ہے
جل رہا تھا دھوپ کی تاخیر سے بندھیاچل پہاڑ ۔۔۔ کثرتِ باران سے اُسکے قلب میں ٹھنڈک پڑی
کوہ کی چوٹی ہے گویا ابر کی آرام گاہ ۔۔۔ دجھ کے پانی سے تھک کر انکو یاں راحت ملی
پُر فضا برسات یہ جسمیں ہیں جوہر بےشمار ۔۔۔ دِل چُراتی ہے نسیانِ رمانکی صدا
ہر طرف سے جو درختوں کے لئے ہمدرد ہے ۔۔۔ ہر بشر کے واسطے ہے باعثِ نشو و نما

حسرت و ارماں تمہارے بھی بر آویں اندنوں
یہ دُعائے عاشقِ ناشاد ہے اَے دِل رُبا

——— پربھو دیال مصرعاشق

جوشِ حمیّت

علاء الدین خلجی کا ہے ہنگامِ جہانبانی ۔۔۔ غضب چتوڑ گڈھ پر حلقہ زن ہے فوجِ سلطانی
نہیں ہیں طمع زا کچھ مال و زر ہی غارتگر ہیں ۔۔۔ مگر اک حُسنِ شہرت یا فتہ ہے حرص کا بانی

وہ کیسا حسن؟ جسکی عشق سے ہے زینت افزائی — حسین وہ کون؟ رانا بھیمسی کی پدمنی رانی
ابھی چتوڑ کا رانا لکھمسی چونکہ ہے کمسن — تو ساری ملکیت پر بھیمسی کی ہے نگہبانی
بہادر راجپوت آمادہ گو لڑنے پہ ہیں یکسر — مگر کچھ روکتی ہے خیلِ دشمن کی فراوانی

اثر لایا یہ استقلال محصورین کا بارے — عدو کے جوش پر پڑنے لگی گردِ پشیمانی
تو پھر اس شرط پر بڑھنے کو خلجی ہوگیا راضی — کہ دیکھے محض آئینہ میں عکسِ حسنِ جانانی
گوارا تھی مگر یہ بات بھی کب راجپوتوں کو — کہ جنسِ آبرو کی بہ بزمِ دشمن یوں ہو ارزانی
کیا منظور رانی نے مگر یہ حکمِ شاہی کو — کہ اس سے تو زیادہ تھی بہائے خونِ انسانی
گیا وہ بندۂ نفس آہ لیکر چند ہمراہی — کہ تھا کب راجپوتی بات میں کچھ نقصِ ایمانی
ملالی عشق نے تو حسن سے تعبیر سازی — بڑھے کچھ اور بھی نظارہ سے جذباتِ شہوانی
گیا جب بھیمسی آخر اُسے لشکر میں پہنچانے — بنایا خسرو پیمان شکن نے اسکو زندانی
رہائی شاہ نے موقوف کی رانی کی آمد پہ — نکالی نامرادی نے یہ تدبیرِ ہوس رانی

خبر اس واقعہ کی جلد ہی چتوڑ گڈھ پہنچی — اُبل اُٹھا جوانمردوں کا اِکدم خونِ شریانی
مگر کچھ سوچ کر رانی نے رد کا جوشِ بیجا کو — ہوئی تیار خود جانے کو سوئے خصمِ ہیجانی
کہا جوشِ حمیت نے کہ ہے وجہ اسیری تو — مجھی پر فرض ہے اب مخلصی کی سعیِ امکانی
منگائے سات سو ڈولے وہیں پر اس فدائی نے — چھپا ہر ایک میں اک اک تیغ زن میدانی
اُٹھایا ان کو یکسر بھیس بدلے راجپوتوں نے — وہ دیوی آہ نکلی گڈھ سے یوں با عزمِ پنہانی
خبر دے یہ جا پہنچی شہِ عاشق کے کانوں تک — کہ آتی ہے لئے سکھیوں کو خود معشوقِ جانانی

ہُوا وہ سُنکے محوِ انتظارِ شوقِ بے پایاں — یہ دل پر ہو گیا طاری فریبِ رنگِ میقانی
پہونچکر پدمنی نے شاہ سے اِسطرح کہلایا — کہ آخر بار شوہر سے ملے با پاک دامانی
جو تسخیرِ دلِ معشوقہ تھی لازم بہرصورت — اجازت مِل گئی مشتاق کو پھر تو باسانی
مگر کچھ حد نہ تھی خلجی کے حیرت اور غصہ کی — چلی گڈھ کی طرف جسوقت رانا کو لئے رانی
بڑھی پھر تعاقب جب سپاہِ اشتعال آگین — تو نکلا آہ ہر ڈولے سے اِک جانباز لاثانی
محل میں گرچہ پہونچے بھیمسی اور پدمنی دونو — مگر ہاں ہو گئی ہر ایک ہمراہی کی قربانی
گیا اِسطرح دُشمن لڑتے لڑتے قلعہ کے در تک — ہُوا جنگ و جدل سے پھر ظہورِ فتنہ سامانی
مگر دکھلائی کچھ ایسی بسالت راجپوتوں نے — کہ آخر ہٹ گئی فوجِ عدو با صد پریشانی

پھر اِکبار شاہِ بوالہوس مایوس سا ہو کر — مگر کرب ختم ہونے کو تھی اُمیدوں کی طولانی
گیا پھر ایک فوجِ تازہ لیکر چند سالوں میں — ہُوئی چتوڑ گڈھ کی جسکے ہاتھوں حشر گردانی
یکایک ہر طرف پھیلا جو یہ حالِ جفا کاری — تو سارے گڈھ میں پیدا ہو گئی تشویش و حیرانی
نہ تھی اصلاً وہاں اتنک سپاہِ جنگجو کافی — کہ ہو جس سے کچھ اُمیدِ شکستِ دُشمنِ دانی
جو کچھ تحقیق تھی طرزِ عمل کی نابدی اُس دم — تو رانا نے کیا پھر منعقد دربارِ ارکانی
مگر ہر ایک نے اُس جا سکوتِ حسرت افزا میں — خموشیِ اجل کی نامبارک فال پہچانی
کہا تب اِک پسر سے پھر چلے جانیکو رانا نے — نہ تا رہجائے دِل میں احتمالِ خانہ ویرانی
مگر منظور تھی کِس کو اہانت روحِ باقی کی — کسی کو بھی نہ تھی زنہار پروائے تنِ فانی
جو پھر اصرار تھا پیہم تو بارہ شاہزادوں میں — اجیسی نے بالآخر بات اپنے باپ کی مانی
سُنی جب یہ خبر کُل ساکنانِ قلعہ نے بارے — ہُوئی تب مظہرِ حکمِ قضا ایمائے رُوحانی

بڑھا اک جذبۂ ایثار اُس دم راجپوتوں میں   بنی کیا کیا شہادت خیز خونِ دل کی جوانی

الگ زیرِ زمیں اِک خانۂ تاریک میں ہر سُو   غضب کی شعلہ ہائے نار سے پیدا ہے تابانی
ہزاروں دیویاں اب جا رہی ہیں آہ جلنے کو   رواں ہے سب کے پیچھے پدمنی با خندہ پیشانی
جنوں زا ہے جو فکرِ حفظِ عصمت پاکبازوں میں   نہیں سودائیوں کو کچھ خیالِ دردِ جسمانی
فدا ہو جائے یکسر آپ اپنی قدر دانی پر   یہی تھا آہ اُس دم اقتضائے نازِ ربانی
غرض جوشِ حمیت نے اثر اپنا یہ دکھلایا   بنا اُف خاکِ آتش میں مزارِ حُسنِ نورانی
ہُوا یہ عبرت آگیں خاتمہ نازک مزاجوں کا   تہ کیے انقلاب انگیز ظلمِ چرخِ دورانی
ہیں اب صرف انجراتِ ارض بھر نیکے لئے آئیں   نہیں جز خطۂ نم آج کوئی بہرِ گریانی

ہُوا جب خاک میں پوشیدہ یوں نورِ حیات آرا   بنی پھر تیرہ بختی سے قضائے دہرِ فانی
وہیں تب راجپوتوں نے بھی پہنے "کیسری بانے"   ہر اک نے آہ دل میں لڑکے مرجانیکی یوں ٹھانی
بجز جسم تو اب کچھ نہ تھی اُمیدِ آسائش   ہوئے تیار سب بہرِ حصولِ حظِ روحانی
غرض نکلا گروہِ سر فروشاں گڑھ کے پھاٹک سے   کہ جانبازی کے لے دشمن سے بھی باج ثنا خوانی
ہُوئے مقتول اور مجروح گو چاروں طرف اعدا   دکھائی گرچہ تیغِ خوں فشاں نے اپنی برانی
بنی گو ایک حظِ سرخروئی وہ فضا ساری   زمیں کا رنگ گو تحریر خونیں سے ہُوا قانی
مگر لڑتے ہی لڑتے کٹ مرا ہر راجپوت آخر   نہ افزونی سے آگے آہ کام آئی گرانجانی
غرض یوں جیت کر خلجی ہُوا پھر قلعہ میں داخل   کہ پوری وصل سے اب عشق کی ہو شرطِ مہمانی
وہاں لیکن بچا رکھا تھا کیا شوقِ شہادت نے؟   نہ یاں تھی تباہی ہر طرف با رنگِ عریانی!

ہُوا برہم مزاجِ شاہ اُسدم نا اُمیدی سے ۔ نہ آیا ہائے دِل میں نقدہ بھی افسوس نادانی
رہِ غارتگری سے پھر لیا مالِ غنیمت سب ۔ ہُوئی اِس طرح کچھ آسودگیِ آزِ نفسانی
غرض شہ کی جفا کوشی پہ بھی جوشِ حمیت نے
نہ ہرگز آبروئے خاص پر پھرنے دِیا پانی

اقبال ورما سحر ہنگامی

"پی کہاں"

شاخ پر ظالم پپیہا گا رہا ہے "پی کہاں" ۔ ایسی بھیگی رات میں چلّا رہا ہے "پی کہاں"
سُننے والوں کو بہت تڑپا رہا ہے "پی کہاں" ۔ اے پپیہے قہر دل پر ڈھا رہا ہے "پی کہاں"
رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

پی کہاں، پھر پی کہاں، پھر پی کہاں، پھر پی کہاں ۔ گر یہی رٹ ہے یہی دھن ہے تو تیرا جی کہاں
چین تجھ کو ایک پل اے غمزدہ پڑتی کہاں ۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں آواز تو نے دی کہاں
روح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

بادۂ اُلفت سے بیحد چُور ہے مستانہ وار ۔ جھومتا ہے تو فضائے چرخ میں رِندانہ وار
جل رہا ہے آتشِ فرقت میں تو پروانہ وار ۔ یہ صدا ہے "پی کہاں" لب پر ترے دیوانہ وار
رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

دیکھتا ہوں اپنے بستر سے تری بیتابیاں ۔ ہے کبھی مشرق سے مغرب کو تو جلدی سے رواں
پھر پلٹتا ہے تو جاتا ہر طرف ہے بیگماں ۔ ہر گھڑی ہر وقت یہ دو لفظ ہیں وردِ زباں
رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

کس قیامت کا اثر اِن میں بھرا ہے کُوٹ کر   دل نہ تیرا ہوگا خوش رنج والم سی چھوٹ کر

درد وُہ ہے "پی کہاں" میں رہ گیا دِل ٹُوٹ کر   پھر سُنی آواز تیری رو دئیے ہم پھوٹ کر

رُوح فرسا جان لیوا یہ صَدا ہے "پی کہاں"

کِس نے سِکھلایا تجھے یہ دِل لگانے کا شعُور   کِس نے تیرے شیشۂ دِل کو کیا ہے چُور چُور

مُجرمِ اُلفت ہے شاید، ہے یہی تیرا قصُور   بولتا پھرتا ہے یُوں جو رات بھر نزدیک دُور

رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

تو ابھی دل کی طرح مُضطر تھا فرشِ خاک پر   پھر اُڑا جا کر کہاں پہنچا سرِ افلاک پر

بجلیاں تُو نے گِرائی ہیں دلِ غمناک پر   "پی" سوا مطلب نہیں، صدقے خیالِ پاک پر

رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

"پی کہاں" سُنکر بہت سے عابدِ خلوت نشین   جِنکا جُز یادِ الٰہی اَور کچھ مطلب نہیں

اَیسی گُذری اُنکے دِل پر ہوگئے اندوہگین   رو دئیے تیری صَدا سُنکر اِسے تو کر یقین

رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

"پی کہاں" کو تیرے کِس نے زیرِ لب دوہرا دیا   ہاں اکیلی رو رہی ہے بام پر اِک مہ لقا

اُسکا "پی" پردیس میں ہے، ہے گرفتارِ بلا   یہ اندھیری رات یہ برسات یہ کالی گھٹا

رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

"پی کہاں" کی یہ صَدا رہ رہ کے تڑپاتی رہی   کوک تیری اے پپیہے دِل کو برماتی رہی

"پی کہاں" کو غمزدہ چُپکے سے دوہراتی رہی   زیرِ لب کہتی رہی اُس پر بھی شرماتی رہی

رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

"پی کہاں" کے سحر نے دِل پر کیا اَیسا اثر   سو گئے ہم پر وُہی عالم رہا پیشِ نظر

سچی اُلفت نے تجھے رکھا سراپا باخبر "پی کہاں" کہتے ہوئے پایا تجھے وقتِ سحر

رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

محو ہوا اتنا تو کم سے کم خیالِ یار میں درد ہو اتنا تو باسطؔ اِس دلِ بیمار میں

آہ سُن کر لوگ رو دیں کوچہ و بازار میں مُنہ سے نالہ بھی نکلجائے تری گفتار میں

رُوح فرسا جان لیوا یہ صدا ہے "پی کہاں"

(باسطؔ بسوانی)

عُمرِ رفتہ

مِری عمرِ رفتہ یہ کیا کر گئی تو
مِرے ساتھ مِل کر دغا کر گئی تو

مجھے چھوڑ کر راہ لی تو نے اپنی
رفاقت کا حق خوب ادا کر گئی تو

تِری یاد سے دل پہ لگتے ہیں چرکے
یہ مجھ پہ نرالی جفا کر گئی تو

گذشتہ زمانہ گُناہوں میں گذرا
خطا وار ہوں میں خطا کر گئی تو

یہ رہ رہ کے پچھتاوا آتا ہے ہر دم
کہ رُسوا مُجھے جابجا کر گئی تو

نہیں یاد بچپن کا مُجھ کو زمانہ
بہُت جلد نشو و نما کر گئی تو

تجھے ڈھونڈھ کر اب میں لاؤں کہاں سے
پتہ بھی نہ اپنا بتا کر گئی تو

پھنسایا ہے دُنیا کے جھگڑوں میں مجُھ کو
یہ برتاؤ مجُھ سے بُرا کر گئی تو

الگ ہو گئی مجھ سے آ کر جہاں میں
وفا خوب اے بیوفا کر گئی تو

عدم کو روانہ ہوئی مجھ سے پہلے
عبث اپنی ہستی فنا کر گئی تو

اُٹھاتا ہوں صدموں پہ صدمے ہزاروں
مجھے رنج میں مُبتلا کر گئی تو

کہا عمرِ رفتہ نے یہ سُن کے مجھ سے ذرا پھر تو کہنا کہ کیا کر گئی تو
کئے جرم خود اور کہتے ہو مجھ سے بُرا کر گئی تو بھلا کر گئی تو
ہم اے عمرِ رفتہ تری رمز سمجھے ہمارا ہی اُلٹا گلہ کر گئی تو
حقیقت میں تیری خطا کچھ نہیں ہے کہ جو کر گئی تو بجا کر گئی تو
ہمیں تھے نہ تیری توجہ کے قابل مگر تجھ سے جو ہو سکا کر گئی تو
گنہگار کا ساتھ دینا تھا مشکل تجھے شرم آئی حیا کر گئی تو
نصیحت سے خالی نہیں تیرا جانا کہ تنبیہ حد سے سوا کر گئی تو
سمجھ جائیں رکھتے ہوں گر عقل کچھ بھی سبق ہم کو ایسا پڑھا کر گئی تو
جو اب بھی ہوں تائب ہم افعالِ بد سے تو گویا ہمیں پارسا کر گئی تو
گناہوں کا جانا ہے روگ بالکل ہمارے مرض کی دوا کر گئی تو
رہے گا ہمیں یاد تیرا یہ احساں کہ تاکید یادِ خدا کر گئی تو

وجاہتؔ نہ غفلت میں کھو عمر باقی
سنبھل دیکھ بس اب ذرا کر گئی تو

وجاہت حسین صدیقی

جوشِ دلداری

اے درختِ خشک بے برگ و ثمر کچھ نہیں اے سنگ دل تجھ کو خبر
دمبدم تجھ سے لپٹتے کون ہیں تیری شاخوں سے چمٹتے کون ہیں
تجھ سے ہم آغوش ہیں وہ نازنیں لوثِ دنیا کا اثر جن پر نہیں

جن کے پہلو میں ہیں وُہ مسرور دِل　　فِکرِ فردا سے نہیں جو مضمحل
دیکھ تو! معصوم لڑکے لڑکیاں　　کر رہے ہیں تجھ سے کیا اٹھکیلیاں
تجھ پہ چڑھتے ہیں اُترتے ہیں کبھی　　حوصلہ کرتے ہیں ڈرتے ہیں کبھی
آہ! یہ سرمستیاں خُوش فعلیاں　　چند دن کی ہیں یہ سب بےفکریاں
پھر یہ ہوں گے اَور دُنیا کے وبال　　پھر یہ ہوں گے اَور ہستی کی جدال
زندگی کی کشمکش اَور ریل پیل　　جب ہوئی بھولینگے سب بچپن کے کھیل
حیف تجھ میں جوشِ دلداری نہیں　　آج کیوں وُہ شوقِ گلکاری نہیں
کاش! ظالم! ہوں اگر میں تیری جا　　اَور مجھے لپٹیں یہ بچے مہ لقا
خواہ جاڑا کڑکڑاتا کیوں نہ ہو　　گو خزاں کا دَور دورہ کیوں نہ ہو
ان کی خاطر میں نِکالوں برگ و بار　　اَور دِکھاؤں سیرِ گلہائے بہار
پھُول ہو میرے بدن کا داغ داغ
تا یہ ننھے ننھے دِل ہوں باغ باغ

میرزا اعجاز حسین بی اے

ایک رشی کے داغِ جگر کی کہانی

راجہ دِشرتھ کی اپنی زبانی

ابر تھا چھایا ہُوا اَور فصل تھی برسات کی　　تھی زمین پہنے ہُوئے وردی ہری بانات کی
آفتاب اوڑھے ہُوئے تھا چادرِ آبِ سیاہ　　برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ
بادل اِتنے میں دُرِ ناسفتہ برسانے لگا　　داستانِ قُلزم و عُمّاں کو دوہرانے لگا

کِس لئے ڈھایا ہے اِس بیکس پہ یُوں تُو نے سِتم / اِک رشی کے گھر میں ہوا کر لیا جس نے جنم
باپ کے بیٹے کے اَور ماں کے جگر تقدیر سے / چھِد گئے اِک ساتھ ہی اے راجا تیرے اِس تیر سے
میری ماں اَور باپ کو اس وقت میرا انتظار / کر رہا ہوگا وہاں بے چین بے کل بے قرار
دیر سے پیاسے تھے شدّت کی انہیں تھی لگی پیاس / بندھ رہی دونو کو ہوگی میرے گھر آنے کی آس
جلد جا ہتیا سُنا جلدی یہ میرے باپ کو / اَور بچا اُن کے غضب سے راجا اپنے آپ کو
کیونکہ اے راجا سراپ اُس نے اگر تجھ کو دیا / یاد رکھ دم بھر میں تو جل کر بھسم ہو جائیگا
لیکن اوّل میرے سینے سے جُدا یہ تیر کر / درد سے مجھ کو بچانے کی کوئی تدبیر کر
تاکہ جان پر الم نکلے ذرا آرام سے / اَور نہ ہوں میں شرمسار اِس کربِ ہنگام سے
اِس قدر کہتے ہی لڑکے کی نظر پتھرا گئی / اُس کے مُنہ پر مُردنی اَور مجھ پہ حسرت چھا گئی
کھینچتے ہی تیر تن سے جان رُخصت ہو گئی / رُوح اُس کی گود میں پرماتما کے سو گئی
مجھ سے نادانستہ سرزد ہو چکا تھا جو گناہ / تھا خیال اُسکا وُہ دریا جسکی ملتی تھی نہ تھاہ
دِل میں درد و کرب کا چشمہ اُبلتا تھا میرے / کوئی چٹکی سے کلیجے کو مسلتا تھا میرے
سَرنگوں ہو کر کھڑا تھا میں سرہانے لاش کے / دِل میں کہتا تھا مجھے یہ تیر لگتا کاش کے
سوچتا تھا میں مرا کفارۂ عصیاں ہو گیا / نذر ہے جس کی جگر اُس درد کا درماں ہو گیا
الغرض اِس فکرِ جاں فرسا میں ہو کر مُبتلا / مَیں رشی کے گھر کو رُک رُک اَور تھم تھم کر چلا
جھونپڑے کے پاس پہنچا تو مجھے آیا نظر / باپ ماں لڑکے کے بیٹھے ہیں زمیں کے فرش پر
دونو کے دونو ہیں وُہ نابینا و پیر و ناتواں / نُور آنکھوں میں نہیں لیکن ہے چہروں پر عیاں
باغ میں گویا کہ ہیں دو طائرِ بے بال و پر / چھوڑ رکھا ہے جنہیں صیّاد نے پر کاٹ کر
رہ گئے تھے تن تنہا اب یہ دونوں تیرہ بخت / آسماں تھا دُور ان سے اور زمیں تھی ان پہ سخت

ہُو کا عالم تھا یہاں کرتا تھا جنگل بھائیں بھائیں　　سنسنی اُٹھتی تھی سُن سُنکر ہوا کی سائیں سائیں
اِس جگہ اِن بیکسوں کا رہنما کوئی نہ تھا　　ناؤ تھی منجدھار میں اَور ناخدا کوئی نہ تھا
ایک لنگر تھا سو مجھ سے وہ گیا تھا ٹوٹ ابھی　　ساتھ بیٹے کا بچاروں سے گیا تھا چھوٹ ابھی
کر رہے تھے اپنے بیٹے کا وُہ دونو اِنتظار　　آ رہا تھا یاد وُہ اُس وقت اُن کو بار بار
دیدیا دھوکا اُنہیں میرے قدم کی چاپ نے　　کی ملامت اِس طرح لختِ جگر کو باپ نے
جان بابا تُو نے دیر اتنی لگائی کِس لئے　　پیاس جلد آکر نہیں میری بُجھائی کِس لئے
کھیل میں تو نے گنوایا وقت گھر کے کام کا　　کچھ خیال آیا نہ ماں اور باپ کے آرام کا
جلد جلد اُٹھتے نہیں کِس واسطے تیرے قدم　　بھاگ کر آ۔ تجھ کو چھاتی سے لگائیں اپنے ہم
باپ ماں کی آنکھ کے تارے تیری دکھیاری ماں　　فکر اَور چنتن میں گھڑیاں گنتی بیٹھی ہے یہاں
دی ہے بُڈھے باپ نے جِھڑکی اگر بیٹا تجھے　　مَت خفا ہو بلکہ میری جاں بُھلا دل سے اُسے
یاد رکھ تجھ کو سِکھاتا ہے دھرم تیرا یہی　　اُس سے نیکی کر ہمیشہ جو کرے تجھ سے بدی
کِس لئے چُپ چاپ ہے اَے میرے پیارے کچھ تو بول　　اِسقدر کیوں ہو گیا دلگیر گھنڈی دِل کی کھول
اُنکی اِن باتوں نے ڈالے زخم دل میں جان میں　　اور انڈیلا گرم کرکے سیسہ میرے کان میں
گڑ گیا تھا مَیں زمیں میں بند تھی میری زباں　　وُہ اُدھر رطب اللساں اَور مَیں اِدھر آتش بجاں
لا سکا جب اپنی خاموشی کی مَیں خود بھی نہ تاب　　جی کڑا کرکے دیا مَیں نے اُسے آخر جواب
مَیں نہیں ہوں اے بھگت بھگوان کے بیٹا تیرا　　راجہ ہُوں کمبخت دشرتھ میں اس اجڑے دیش کا
آج مَیں کرنے شِکار آیا تھا سانبھر کا اِدھر　　ایک ندی پر ہُوا تقدیر سے میرا گذر
پانی بھرتا تھا وہاں فرزند تیرا ہائے ہائے　　جا لگا بھولے سے اُس کو تیر میرا ہائے ہائے
اَے رشی اِس سے زیادہ اَور تجھ سے کیا کہوں　　تیری رحمت اَور کرپا کا فقط محتاج ہُوں

مختصر تھی گرچہ میری داستانِ پُر الم ۔۔۔ برقِ خرمن سوز کے گرنے سے لیکن تھی نہ کم
جب رشی میری زبانی سُن چکا یہ ماجرا ۔۔۔ آگیا غش اُس کو اور دھم سے زمیں پر گر پڑا
دیر تک القصہ طاری اُس پہ بیہوشی رہی ۔۔۔ نکتہ چیں دردِ جگر پر خود فراموشی رہی
آہ! آخر اِک بھری اُس نے کہ جل اُٹھا جگر ۔۔۔ یاد رکھوں گا میں اُس آوازِ غم کو عمر بھر
اِس طرح مجھ سے کیا اُس تیرہ قسمت نے خطاب ۔۔۔ یاس اور حسرت میں تھا ڈوبا ہُوا اُسکا جواب
خود بخود چل کر نہ میرے پاس تو آتا اگر ۔۔۔ اور نہ دیتا اِس مصیبت کی تو مجھ کو آ خبر
میرے نورِ چشم کا یہ خونِ ناحق بے گماں ۔۔۔ رُوئے دُنیا سے مٹا دیتا تیرا نام و نشاں
مجھ کو تیرے جرم کی نسبت ہُوا پُورا یقیں ۔۔۔ دیدہ و دانستہ یہ تجھ سے ہُوا سرزد نہیں
تو ہے پتلا لغزشوں کا آخر اک اِنسان ہے ۔۔۔ گرچہ تو اس وقت پاپی ہے مگر انجان ہے
ورنہ اے راجا کسی کا رن نہ تو بچتا کبھی ۔۔۔ اور تیری نسل بھی برباد ہو جاتی سبھی
لے چل اب ہم بدنصیبوں کو وہاں تو جلد تر ۔۔۔ جس جگہ وہ چاند کا ٹکڑا ہے سوتا بے خبر
تاکہ ہم دل کا نکالیں آخری ارمان بھی ۔۔۔ اپنے بیٹے پر نچھاور جی کریں اور جان بھی
مار کر دھاڑیں غرض سر پیٹ کر روتے ہُوئے ۔۔۔ اپنے دِل کو تھامتے اور جان کو کھوتے ہُوئے
میرے پیچھے پیچھے لاٹھی ٹیکتے پہنچے وہاں ۔۔۔ سو رہا تھا خاک میں لختِ جگر اُن کا جہاں
لاش پر دونوں گرے یوں باپ نے نوحہ کیا ۔۔۔ جِس کو سُن سُن کر زمیں کانپی فلک تھرا گیا
کس لئے اُٹھ کر نہیں کرتے ہمیں بیٹا سلام ۔۔۔ خاک میں عزت ملاتے ہو ہماری ہائے ہائے
چاند سے مکھڑے پہ ڈالی ہے نقابِ خاک و خون ۔۔۔ شکل پہچانی نہیں جاتی تمہاری ہائے ہائے
اپنے رُوٹھے کو منانے چل کے خود آئی ہے ماں ۔۔۔ کہہ رہی ہے ماں جائیں تجھ پہ واری ہائے ہائے
تیرے سینے میں جو مارا تاک کر راجہ نے تیر ۔۔۔ کیوں نہ ہم پر بھی چلا دے اِک کٹاری ہائے ہائے

بھولنا چاہینگے ہم لیکن نہ بھولیں گے تیری ——— شکل بھولی بھولی باتیں پیاری پیاری ہائے ہائے
میں نے یہ کس دن کہا تھا خاک ہی میں جا کے مِل ——— اتنی بھی اچھی نہیں ہے خاکساری ہائے ہائے
تم سدھارے سورگ کو اور ہم کو چھوڑا نرک میں ——— چاہ کی وہ ریت کیوں تم نے بساری ہائے ہائے
تیری اندھی اور دُکھیا ماں کی بھی تیری طرح ——— کر سکو نگا کس طرح خدمتگزاری ہائے ہائے
تم کھلاتے تھے ہمیں لا لا کے کھانا صبح شام ——— لائیگا جنگل سے کون اب پھل پھلاری ہائے ہائے
ایک بیٹا تھا لیا قسمت نے وہ بھی ہم سے چھین ——— ہوگئی ہے زندگانی ہم پہ بھاری ہائے ہائے
جا چکا سامان اپنا دہر کا بیکنٹھ کو ——— رُک نہیں سکتی ہے رخصت اب ہماری ہائے ہائے
بین یہ کر کرکے اُس نے مجھ پہ ڈھائے تھے ستم ——— آخرش واہ کرم کا اُس نے دیا مجھ کو حکم
بے خود اور مبہوت بن کر میں کھڑا تھا پاس ہی ——— یک بیک مجھ سے پلٹ کر یوں لگا کہنے رشی
ایک ہی تھا یہ میرا لختِ جگر نُورِ نظر ——— تُو نے اِسکی جان لی تجھ پہ ہے خوں اُس کا مگر
ہم پہ بھی اک وار کردے تو تیرا احسان ہو ——— بندشِ غم سے کہیں آزاد ہماری جان ہو

یاد رکھ لیکن میرا کہنا یہ ایں جاہ و حشم
تیری قسمت میں بھی لکھا ہے تیرے بیٹے کا غم

(ظفر علیخان)

حُبِّ وطن

حبِ وطن کے آج ترانے سنائینگے ——— ہم روز جسکا کھاتے ہیں آج اُسکا گائینگے

حبِ وطن وطن تیرا قلب و جگر میں ہے ——— جو بہ صفت نمود تو دل کے گھر میں ہے
میں ہوں وطن میں اور وطن میرا دل میں ہے ——— شائد تیرا ہی گھر یہ سویدا کے تل میں ہے

وہ خُون کا قطرہ سینہ میں جس کی طپید ہے — مسکن ترا وہی ہے یہ تیری خلید ہے
ہستی تیری حقیقتِ ہستی کا راز ہے — تو اُلفت و وفائے ترنّم کا ساز ہے
مُونس ہے تیری یاد مُسافر کے واسطے — تو راگنی کی دیوی ہے شاعر کے واسطے

غُربت کے دشت بن جو کھڑا ایک غریب ہے — راحت سے کوسوں دُور وہ حرماں نصیب ہے
خارِ سفر سے پاؤں ہُوا پاش پاش ہے — اور رات کے بسیرے کی دلکو تلاش ہے -
دھوپ اپنا رنگ رُوپ بھی دکھلا کے رہ گئی — آخر کی شوخ لال کرن آکے رہ گئی
طائر چلے ہیں دشت سے مُنہ موڑ موڑ کر — سائے بھی اُٹھ چلے ہیں اکیلے کو چھوڑ کر
یادِ وطن کی اِس دلِ نالاں سے پُوچھئے — صُبحِ وطن کی شامِ غریباں سے پوچھئے

دشتِ وغا میں سوتا پڑا اِک دلیر ہے — تلوار کا دھنی ہے غضنفر ہے شیر ہے
سُورج ابھی جو صُبح کا پرچم اُڑائے گا — فوجِ غنیم کے یہ مُقابل میں جائے گا
ناموس پر وطن کی سدا اِسکا دھیان ہے — کاندھے پہ تیغ اور ہتھیلی پہ جان ہے
اب سو گیا ہے خوف و خطر سارے بھول کر — گھر کو چلا ہے خواب میں کیا پھول پھول کر

مُدت کے بعد آج جو گھر اپنے آتا ہے — بچوں کو بھینچ بھینچ گلے سے لگاتا ہے
بیوی کو دیکھتا ہے مسرت سے لال ہے — اور بوڑھی ماں سے کہتا ہے کیا تیرا حال ہے
جو آپ بیتیوں کے فسانے بیاں ہُوئے — جوشِ طرب میں آنکھ سے آنسُو رواں ہوئے
اٹھتا ہے کلبلا کے تو پھر دیکھتا ہے کیا — میدان کی ہے سرد زمین پر سر دھرا پڑا

کچھ دیر تک تو اشکِ مُسلسل رواں رہے — حیرت کی ٹکٹکی میں وُہ نقشے عیاں رہے
پھر یک بیک عدو کی طرف دیکھنے لگا — اور رکھ کے ہاتھ تیغ کے قبضہ پہ یُوں کہا
بچو! تمہارے واسطے میدان میں جاؤنگا — پَیدا کرونگا نام میں پھر گھر کو جاؤں گا
جیتا تو اپنے مُلک کا ابنِ رشید ہوں — مرجاؤں گا تو اپنے وطن کا شہید ہوں

پیپل وہ سامنے جو کھڑا سائے دار ہے — جس سرزمین سے نکلا اُسی پہ نثار ہے
وُہ اُس کو پالتی ہے دانے سے آب سے — دن بھر اِسے بچاتا ہے یہ آفتاب سے
پھُول اِسے پھینکتا ہے تو پھل بھی گراتا ہے — مادر کو سجدہ کرتا ہے شاخیں جھکاتا ہے

شایان ہے خاکِ ہند بھی عزّ و وقار کی — ہستی میری نے بستی یہی اختیار کی
ذرّے میرے بدن کے اِسی سرزمیں کے ہیں — کچھ بھی ہوں رہنے والے مگر سب یہیں کے ہیں
گو خار ہُوں یہ خار اِسی گلستاں کا ہُوں — باشندہ اِک حقیر سا ہندوستاں کا ہُوں
اے مادرِ وطن میں محبت شعار ہُوں — تیرے رحم سے ہُوں میں مگر دلفگار ہُوں
حُبِّ وطن میرے لئے ایماں سے کم نہیں — جاں تک بھی تیرے واسطے جائے تو غم نہیں

دُنیا کے رنج و غم سے میں آرام پاؤنگا
مادر جو تیری گود میں پھر لیٹ جاؤنگا

خواجہ دِل محمدؐ

الٰہی ہمیں دے گہربار آنکھیں صدف کیش والماس آثار آنکھیں
بصارت نواز و پُر انوار آنکھیں جو ہوں قائم اللیل و بیدار آنکھیں
مئے ناب عرفاں سے سرشار آنکھیں

الٰہی یہ دو پُتلیاں نُور کی ہیں کہ پریاں کسی قافِ بلّور کی ہیں
کہ چنگاریاں شعلۂ طُور کی ہیں کہ نیرنگیاں جلوۂ حُور کی ہیں
جنہیں لوگ کہتے ہیں بیمار آنکھیں

الٰہی یہ آئینہ دارِ نظر ہیں کہ اقلیمِ اجسام کا تار گھر ہیں
کہ فوٹو کا کیمرہ بحکمِ بصر ہیں کہ منزل نما شعلِ بحر و بر ہیں
خضر رنگ و الیاس ایثار آنکھیں

بظاہر اگرچہ یہ عُزلت نشیں ہیں فلک سیر ہیں زائرانِ زمیں ہیں
کہیں خورد بیں ہیں کہیں دُور بیں ہیں گلِ نرگسِ شاخِ آہوئے چیں ہیں
مگر کہنے سُننے کو بیمار آنکھیں

دو بادام اطرافِ باغِ ارم ہیں غزالانِ اکنافِ بیتُ الحرم ہیں
مہ و مہرِ افلاکِ لا و نعم ہیں نمائندۂ جامِ ادراکِ جم ہیں
یہ عُقدہ کُشا پردہ بردار آنکھیں

کبھی مہرِ انور کبھی ذرّہ پرور کبھی نُورِ غرم و حیا سے مُنوّر

کبھی اخگر افشاں کبھی برقِ خنجر   کبھی گردِ ظلم و ستم سے مکدر

ہیں یہ شوخ و بے باک عیار آنکھیں

فلک کیا ہے اک سائبانِ آسمانی   ستارے ہیں کیا شربتی کامدانی

گیاہ چمن کیا ہے کمخوابِ دھانی   ہے خورشید کیا طشتِ زرِ زعفرانی

اور ان سب کی ہیں ناز بردار آنکھیں

قلمکاریٔ حسنِ تدبیر دیکھو   سیاہی میں سامانِ تنویر دیکھو

فسوں سازیٔ نقشِ تسخیر دیکھو   اور اک تل میں صد عکسِ تصویر دیکھو

کہ ہیں آبگینوں کا بازار آنکھیں!

وہ محجوبۂ حجلۂ خودنمائی   وہ سونے کی کل تندرستی کی جائی

وہ راحت فزا نیند قدرت کی دائی   جب آئی بس نازنیں ہی میں آئی

کہ ہیں نیند کی عاشقِ زار آنکھیں

جو مشہور ہیں رشکِ شبنم۔ وہ آنسو   پئے زخمِ دل ہیں جو مرہم۔ وہ آنسو

جو ہیں رشتۂ غم بت میں مزم۔ وہ آنسو   یتیمی کے دُر اور درہم۔ وہ آنسو

لٹاتی ہیں اکثر صدف وار آنکھیں

فدا خوبروئی ہے سیبِ ذقن پر   گلِ عارض و زلف و درجِ دہن پر

بنا گوش و بینی و سیمیں بدن پر   لب لعل پر چتون اور بانکپن پر

ہیں ان سارے اعضا کی سردار آنکھیں

زمانے میں ہے بارہا ہم نے دیکھا   بہا شیر کا قصرِ شیریں سے دریا

گرا ہاتھ سے کوہکن کے بھی تیشہ   ہوا قیس پروانۂ شمعِ لیلا

خُدا کی قسم جب ہوئیں چار آنکھیں

زمانے نے کچھ رنگ ہے ایسا بدلا | وفا جس کو کہتے ہیں اب ہے وہ عنقا
نہ شوقِ تلطّف نہ ذوقِ مدارا | جسے دیکھئے ہے وہ مطلب کا شیدا

بدل لیتے ہیں بن کے اغیار آنکھیں

وہ آنکھیں کہ جن سے ٹپکتا لہو ہو | وہ آنکھیں کہ جن میں عداوت کی خُو ہو
رعونت کی رنگت ہو نخوت کی بُو ہو | اور اِن سے نہ چاکِ گریباں رفو ہو

رہیں خُون روتی وہ خونخوار آنکھیں

Saturday

بہا دے یہ اشک آنکھوں کے والی | کہ دُھل جائے آشوب اور اُسکی لالی
خجل ہوں مرے آنسوؤں سے لآلی | ملے باغِ اُمّید کو نونہالی

بنیں رشکِ نیساں گہربار آنکھیں

(احمد حسین خان